جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مُدیر

پروفیسر خورشید احمد

ادارہ ترجمان القرآن

تعارف قاضی گروپ آف کمپنیز

اور اللہ ہی نے تمہارے لئے گھروں کو رہنے کی جگہ بنایا (القرآن)

قاضی انٹرپرائزز 1988 سے پراپرٹی اور کنسٹرکشن کے شعبہ سے منسلک ہیں۔ الحمدللہ جس ادارہ کی بنیاد تقویٰ، توکل، ایمانداری اور جذبہ خدمت خلق پر رکھی گئی تھی اس کو اللہ تعالیٰ نے دن دوگنی رات چوگنی ترقی سے نوازا۔ رب رحیم کا احسان عظیم ہے کہ ادارہ نے اپنے ذیلی اداروں کی محنت اور تعاون سے ترقی کی اور 1999 میں تنظیم نو کرتے ہوئے (قاضی گروپ آف کمپنیز) کا آغاز کیا۔ قاضی گروپ آف کمپنیز میں مندرجہ ذیل ادارے شامل ہیں۔

★ قاضی انٹرپرائزز ★ قاضی کنسٹرکشن ★ قاضی پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز ★ قاضی ڈویلپر ★ قاضی پی وی سی پائپ انڈسٹری ★ اسلامک ویلفیئر فاؤنڈیشن

قاضی انٹرپرائزز ہی کیوں

اس لیے کہ

① ہاؤسنگ کے شعبہ میں بہترین تجربہ کار ٹیم۔ ② 4 منصوبے مکمل کرنے کا اعزاز حاصل (جہاں یا تو ہمارے ممبران رہائش پذیر ہو چکے ہیں اور یا اپنے پلاٹ فروخت کر کے کئی گنا منافع بھی کما چکے ہیں۔ آپ بھی ہمارے منصوبوں میں سرمایہ کاری کر کے فائدہ اٹھا سکتے ہیں) ③ **منی بیک گارنٹی** ہماری ہی ہے اگر آپ نے بغیر دیکھے مکان / پلاٹ خرید اور دیکھنے پر آپ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے بنائے ہوئے منصوبے معیار کے مطابق نہیں ہیں تو آپ اپنی رقم واپس لے سکتے ہیں

④ ہر اتوار کو ہماری گاڑی دفتر سے صبح نو بجے سائٹ وزٹ کے لیے روانہ ہوتی ہے اسلئے پہلے آپ سائٹ دیکھیں اور پھر خریدیں

ہمارے منصوبے

★ الرحمٰن ٹاؤن (مکمل) ★ پاسبان ٹاؤن (مکمل) ★ گلستان راشد فیز (I) مکمل ★ فیملی ولاز مری فیز (I) فیز (II) مکمل

★ فیملی گارڈن اسلام آباد بکنگ جاری ★ موٹروے سٹی فیز (I) فیز (II) بکنگ مکمل ★ فیملی اپارٹمنٹ مری فیز (III) بکنگ جاری

★ موٹروے سٹی فیز (III) بکنگ جاری ★ قاضی اپارٹمنٹ راولپنڈی بکنگ جاری ★ اسلام آباد ہل گارڈن بکنگ جاری

ہمارا دعوی ہمارے منصوبے سب سے سستے اور سب سے بہترین، دیکھیں اور فیصلہ کریں

موٹروے سٹی

خصوصیات

☆ اسلام آباد کی طرح سرسبز و شاداب پہاڑیوں کے دامن میں
☆ نیو اسلام آباد انٹرنیشنل ایئرپورٹ کی بدولت ہر آسائش حاصل
☆ تکشیلہ میوزیم اور گندھارا پارک جیسی سیرگاہیں قریب تر
☆ انشاءاللہ تعالیٰ تمام ضروریات زندگی آپ کے دروازے پر
☆ پاکستان موٹروے سے چند منٹ کی مسافت
☆ فوج کے ریٹائرڈ افراد پر مشتمل منظم سیکورٹی سسٹم کا قیام
☆ اسلامک سینٹر کے لیے پچاس کنال زمین وقف
☆ قیمتوں میں اضافہ کی بدولت منافع بخش سرمایہ کاری
☆ پانی جیسی نعمت کی فراوانی
☆ ہر فیز میں شاپنگ سینٹر
☆ کشادہ سڑکیں اور گلیاں
☆ مسجد، سکول اور ہسپتال گھر کے نزدیک۔

قیمت و طریقہ ادائیگی

قیمت: 9 ہزار روپے فی مرلہ

ایڈوانس: -/1000 روپے فی مرلہ بوقت بکنگ

قسط: -/100 روپے فی مرلہ ماہانہ

خصوصی رعایت

29 فروری 2000ء تک

پلاٹ بک کرانے والے کو 15 ہزار روپے فی کنال کی خصوصی رعایت

سائز پلاٹ 5 مرلہ، 10 مرلہ، ایک کنال

تمام ادائیگی بذریعہ بنک ڈرافٹ بنام موٹروے سٹی اکاؤنٹ نمبر 8- ABL 1100 راشد منہاس روڈ برانچ راولپنڈی

یکمشت ادائیگی پر 10 فیصد خصوصی ڈسکاؤنٹ۔ کل قیمت کی پچاس فیصد یکمشت ادائیگی پر فوری رجسٹری

ہیڈ آفس

قاضی انٹرپرائزز

جنگ بلڈنگ مری روڈ راولپنڈی

فون 554464 فیکس 558633

E-mail: shaukat@isb.comsats.net.pk

web:www.qazi.com.pk

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: پروفیسر خورشید احمد
نائب مدیر: مسلم سجاد

جلد ۱۲۶ | جون ۱۹۹۹ ، صفر ۱۴۲۰ | عدد ۶

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ' ملتان روڈ' لاہور
فون: ۷۸۴۳۶۰۵
فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴
E-mail: tarjuman@pol.com.pk

انتظامی امور

۵ ۔ اے ذیلدار پارک' اچھرہ' لاہور
فون: ۷۵۸۷۹۶ ۔ ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے
زر سالانہ ۱۵۰ روپے

بھارت ۳۰۰ روپے
بنگلہ دیش' ایران ۴۵۰ روپے
مشرق وسطیٰ' یورپ
شرق بعید' افریقہ ۶۵۰ روپے
امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا ۹۰۰ روپے

ڈ بنک ڈرافٹ
بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

نرالی قومیت

حقیقت یہ ہے کہ انسانی اجتماعات کی تاریخ میں اسلامی جماعت کی حیثیت بالکل نرالی (unique) ہے۔ اسلام سے پہلے بودھ مت اور مسیحیت نے قومیتوں کے حدود کو توڑ کر تمام عالم انسانی کو خطاب کیا اور ایک نظریہ و مسلک کی بنیاد پر عالم گیر برادری بنانے کی کوشش کی۔ مگر ان دونوں مسلکوں کے پاس چند اخلاقی اصولوں کے سوا کوئی ایسا فلسفہ اجتماع نہ تھا جس پر یہ تہذیب و تمدن کا کوئی کلی نظام بنا سکتے۔ اس لیے یہ دونوں مسلک کوئی عالم گیر قومیت نہ بنا سکے بلکہ ایک طرح کی برادری (brotherhood) بنا کر رہ گئے۔ اسلام کے بعد مغرب کی سائنٹفک تہذیب اٹھی جس نے اپنے خطاب کو بین الاقوامی بنانا چاہا، مگر اول یوم پیدائش سے اس پر نیشنلزم کا بھوت سوار ہو گیا۔ لہٰذا یہ بھی عالم گیر قومیت بنانے میں ناکام ہوئی۔ اب مارکسی اشتراکیت آگے بڑھی ہے اور قومیتوں کی حدود کو توڑ کر جماعتی تصور کی بنیاد پر ایک ایسی تہذیب وجود میں لانا چاہتی ہے جو عالم گیر ہو۔ لیکن چونکہ ابھی تک وہ نئی تہذیب پوری طرح وجود میں نہیں آئی ہے جو اس کے پیش نظر ہے، اس لیے ابھی تک مارکسیت بھی ایک عالم گیر قومیت میں تبدیل نہیں ہو سکی ہے۔

اس وقت تک میدان میں تنہا اسلام ہی ایک ایسا نظریہ و مسلک ہے جو نسلی اور تاریخی قومیتوں کو توڑ کر تہذیبی بنیادوں پر ایک عالم گیر قومیت بناتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ اسلام کی اسپرٹ سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک ہی اجتماعی ہیئت کس طرح بیک وقت قوم بھی اور پارٹی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ دنیا کی جتنی قوموں کو جانتے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جس کے ارکان پیدا نہ ہوتے ہوں بلکہ بنتے ہوں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ جو شخص اٹالین پیدا ہوا ہے، وہ اٹالین قومیت کا رکن ہے اور جو اٹالین پیدا نہیں ہوا وہ کسی طرح اٹالین نہیں بن سکتا۔ ایسی کسی قومیت سے وہ واقف نہیں ہیں جس کے اندر آدمی اعتقاد اور مسلک کی بنا پر داخل ہوتا ہو، اور اعتقاد و مسلک کے بدل جانے پر اس سے خارج ہو جاتا ہو۔ ان کے نزدیک یہ صفت ایک قوم کی نہیں بلکہ ایک پارٹی کی ہو سکتی ہے۔ مگر جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہ نرالی پارٹی اپنی الگ تہذیب بناتی ہے، اپنی مستقل قومیت کا ادعا کرتی ہے اور کسی جگہ بھی مقامی قومیت کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنے پر راضی نہیں ہوتی تو ان کے لیے یہ معاملہ ایک چیستاں بن کر رہ جاتا ہے (سید ابوالاعلیٰ مودودی، "اشارات"، ترجمان القرآن، ج ۱۴، عدد ۴، ربیع الثانی ۱۳۵۸ھ، جون ۱۹۳۹ء، ص ۲۴۵-۲۴۶)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

نجات کا راستہ: احتساب

پروفیسر خورشید احمد

زندہ اور عدل پسند قوموں کی پہچان' روح احتساب اور نظام احتساب ہے۔ حضرت علیؓ کا قول پوری انسانی تاریخ کا خلاصہ ہے کہ "قومیں کفر کے ساتھ تو زندہ رہ سکتی ہیں مگر ظلم کے ساتھ نہیں" (اَلْمُلْکُ یَبْقٰی مَعَ الْکُفْرِ وَلَا یَبْقٰی مَعَ الظُّلْمِ)۔ تزک جہانگیری میں جہانگیر جسے دوست اور دشمن سب عدل کی علامت قرار دیتے ہیں' کہتا ہے کہ "بے انصاف معاشرہ اور حکومت ایک گھن لگی لکڑی کی مانند ہیں جو کسی وقت بھی گر جاتی ہے اور حکمران' رعایا اور سلطنت سب کچھ ختم ہو جاتا ہے"۔

پاکستانی قوم جس اجتماعی عذاب میں مبتلا ہے اور جس کی سزا کم و بیش ہر فرد کو بھگتنا پڑ رہی ہے اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم نے اللہ سے کیے ہوئے عہد وفا کی خلاف ورزی کی۔ اس کے نتیجے میں ہم ایک ہمہ گیر نظام ظلم کے شکنجے میں پھنس گئے۔ پھر اس شکنجے کو توڑ کر ظالموں اور خون چوسنے والوں سے نجات حاصل کرنے اور ان کو کیفر کردار تک پہنچانے کی جدوجہد سے بھی گریز کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ظلم سے سمجھوتہ بھی ظلم کرنے سے کچھ کم جرم نہیں۔ ظالم اور فاسق کی تعریف پر عرش الٰہی لرز اٹھتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "ظالم و جابر اقتدار کے مقابلے میں کلمہ حق کہنا افضل جہاد ہے" (اَفْضَلُ الْجِهَادِ مَنْ قَالَ كَلِمَةَ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ ۔ مشکوٰۃ)۔ آپؐ نے فرمایا: اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو یا مظلوم۔ دریافت کیا گیا: یارسولؐ اللہ! مظلوم ہونے کی حالت میں تو اس کی مدد کر سکتا ہوں' لیکن جب وہ ظالم ہو تب اس کی مدد کیسے کر سکتا ہوں؟ ارشاد فرمایا: تمھارا اس کو ظلم سے روک دینا ہی اس کی مدد ہے (تَمْنَعُهُ مِنَ الظُّلْمِ فَذٰلِكَ نَصْرُكَ اِيَّاهُ ۔ مشکوٰۃ)۔ آپؐ نے فرمایا: ظلم سے بچو' اس لیے کہ ظلم قیامت کے دن تاریکیوں کا باعث ہو گا (اِتَّقُوا الظُّلْمَ فَاِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۔ مشکوٰۃ)۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ: جس نے ظالم کی مدد کی تاکہ اس کے باطل کے ذریعے حق کو مغلوب کر دے تو وہ اللہ کی حفاظت سے

الگ ہو گیا (مَنْ اَعَانَ ظَالِماً بِبَاطِلٍ لِیُدْحِضَ بِبَاطِلِهٖ حَقًّا فَقَدْ بَرِیَٔ مِنْ ذِمَّةِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ - المعجم الصغیر للطبرانی)۔ آپؐ نے فرمایا: جس کسی نے ظالمانہ طور پر بالشت بھر زمین لی' قیامت کے دن اس کے گلے میں سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا (مَنْ اَخَذَ شِبْرًا مِنَ الْاَرْضِ ظُلْمًا فَاِنَّهٗ یُطَوَّقُهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مِنْ سَبْعِ اَرَضِیْنَ - مشکوٰۃ)۔

حضورؐ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ "دھاگا اور سوئی تک ادا کر دو اور خیانت سے بچو اس لیے کہ یہ خیانت قیامت کے دن عار اور ندامت کا باعث ہو گی"۔ (اَدُّوا الْخِیَاطَ وَالْمِخْیَطَ وَاِیَّاكَ وَالْغُلُوْلَ فَاِنَّهٗ عَارٌ عَلٰی اَهْلِهٖ یَوْمَ الْقِیَامَةِ - مشکوٰۃ)۔ ایک غزوہ میں شریک مجاہد نے صرف ایک جبہ (عبا) کی حد تک خیانت کی تو جہاد جیسی عبادت بھی اس کے کام نہ آئی' اور آپؐ نے فرمایا: وہ مر گیا' وہ آگ میں ہے--- رشوت لینے اور دینے والے دونوں کے لیے جہنم کی وعید ہے۔ (اَلرَّاشِیْ وَالْمُرْتَشِیْ کِلَاهُمَا فِی النَّارِ) آپؐ نے فرمایا: جس قوم میں خیانت کا بازار گرم ہو گا اس قوم میں اللہ تعالیٰ دشمن کا خوف اور دہشت پھیلا دے گا۔ جس معاشرے میں زنا کی وبا عام ہو گی وہ فنا کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ جس سوسائٹی میں ناپ تول میں بددیانتی کا رواج عام ہو گا' وہ رزق کی برکت سے محروم ہو گا اور جہاں ناحق فیصلے ہوں گے' وہاں خون ریزی لازماً ہو کر رہے گی' (مشکوٰۃ)۔

قرآن کا فیصلہ ہے کہ جب ایک معاشرہ' ظلم' فساد' رشوت' بدعہدی اور ناانصافی میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر معاشرے کے وہ لوگ بھی تباہ ہوتے ہیں جو ان معاصی میں مبتلا نہ ہوں مگر وہ معاشرے کو اس بگاڑ سے روکنے کے لیے جدوجہد نہیں کرتے' ظالم کا ہاتھ نہیں روکتے اور ذمہ داروں کے احتساب سے بے پروائی برتتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک آگ ان کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے لیتی' وہ محفوظ ہیں' لیکن فی الحقیقت وہ محفوظ نہیں ہیں اور نہیں رہ سکتے جب تک وہ بگاڑ کی قوتوں سے نبرد آزما نہ ہوں اور حق اور انصاف کو غالب کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی نہ لگا دیں:

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ج وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ○ (الانفال ۸: ۲۵) اور بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انھی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنھوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔ اور جان رکھو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مسلم معاشرے کی صحت و ترقی کا انحصار جس چیز پر ہے وہ قانون کی حکمرانی' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' انصاف کا قیام خواہ خود اپنے اور اپنے اعزہ و اقربا ہی کا معاملہ کیوں نہ ہو' قانون کے نفاذ میں مکمل مساوات اور برابری اور بڑے اور چھوٹے' اور طاقت ور اور کمزور میں عدم تفریق ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ز وَلَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ط

اِعْدِلُوْا قف هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ز (المائدہ ۵:۸) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِالْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ج اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا قف فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ج وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ٥ (النساء ۴: ۱۳۵) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علم بردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمھارے انصاف اور تمھاری گواہی کی زد خود تمھاری اپنی ذات پر یا تمھارے والدین اور رشتے داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مال دار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ ان کا خیرخواہ ہے۔ لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔

اور پھر اس امت اور اس کے ایک ایک فرد کی یہ ذمہ داری قرار دی کہ وہ معروف اور بھلائی کا حکم دے اور منکر اور برائی سے روکنے کو اپنی زندگی کا مقصد اور شعار بنا لے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط (اٰل عمرٰن ۳:۱۱۰) اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

ہر مسلمان پر فرداً فرداً، اور مسلم امت اور مسلم معاشرے اور ریاست پر اپنی قدرت اور اختیار کے مطابق، امربالمعروف اور نہی عن المنکر لازم کیا گیا ہے۔ اسلامی ریاست اور معاشرے میں تمام اختیارات، اقتدار اور قوت کا مقصود یہی امربالمعروف اور نہی عن المنکر اور قسط و عدل کا قیام ہے۔ امام ابن تیمیہؒ اس کا خلاصہ یوں بیان کرتے ہیں:

اسلامی حکومت میں تمام اختیارات کا مقصود امربالمعروف و نہی عن المنکر ہے، خواہ یہ اختیار بڑی ولایت الحرب الکبریٰ (محکمہ دفاع) کے پاس ہو، جسے سلطنت کی نیابت حاصل ہو، یا چھوٹی ولایت حرب کے پاس ہو جیسے پولیس اور قضا (عدالت) یا ولایت مال کے پاس ہو جیسے شعبہ مالیات اور ولایت احتساب۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۲۸، ص ۶۶)

ظلم نام ہے ہر حق تلفی کا، اس کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ وَضْعُ الشَّئْيِ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ یعنی جس شے اور امر کو جو کچھ ہونا چاہیے اسے وہاں سے ہٹا دینا ظلم ہے۔ الماوردی نے ظلم کی تعریف یوں کی ہے:

ظلم کا شرعی مفہوم یہ ہے کہ ناانصافی کے ساتھ حق کو چھوڑ کر باطل کو اختیار کیا جائے اور زیادتی

کرے۔ کسی نے کہا کہ کسی دوسرے کی ملکیت میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف اور حد سے تجاوز ظلم ہے (محمد علی تھانوی' اصطلاحات الفنون)۔

یہ تصرف خواہ کسی فرد کی ملک یا حقوق میں ہو' یا بحیثیت مجموعی معاشرہ' ریاست اور دولت عامہ کے معاملات میں۔ مسلم معاشرے کو ظلم اور خیانت سے پاک کرنے کے لیے حسبہ اور دیوان مظالم کے ادارے وجود میں آئے۔ معاشرے کے اجتماعی حقوق و آداب سے لے کر عام انسانوں' اور خصوصیت سے کمزوروں کے حقوق کے تحفظ کو غیر معمولی اہمیت دی گئی۔ ملت کی اجتماعی دولت اور افراد کی ذاتی املاک کو ظالموں' غاصبوں' بدکردار حکمرانوں اور بددیانت عاملوں کی چیرہ دستی سے محفوظ رکھنے اور حقوق و فرائض ادا کرنے کے لیے مسلمانوں نے ایک ایسا موثر نظام قائم کیا جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔

خود حضور پاکؐ کا ارشاد ہے کہ "مال دار آدمی کا قرض ادا نہ کرنا اس کی عزت اور سزا کو حلال کر دیتا ہے" (لَيُّ الْوَاجِدِ يَحِلُّ عِرْضَهُ وَعُقُوبَتَهُ۔ سنن ابوداود)۔

موسوعہ فقہ عمرؓ میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ معن بن زائدہ نے بیت المال کی مہر کے نقش پر ایک مہر بنوا لی اور ایک جعلی دستاویز تیار کر کے بیت المال سے کچھ رقم حاصل کر لی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے سو درے مارے اور محبوس کر دیا۔ اس کے بارے میں کسی نے سفارش کی تو آپؓ نے اسے پھر سو کوڑے مارے۔

اس سلسلے میں بڑے اور چھوٹے' امیر اور غریب اور ذی حیثیت اور بے سہارا کے درمیان کوئی فرق نہیں بلکہ جو جتنا بڑا' قوی اور صاحب حیثیت ہے اس پر گرفت اتنی ہی زیادہ سخت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ قریش کو ایک مرتبہ ایک مخزومیہ عورت کے بارے میں جس نے چوری کی تھی' بہت شرمندگی اٹھانا پڑی۔ انھوں نے مشورہ کیا کہ اس کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی سفارش کرے۔ کہنے لگے آنحضورؐ کے سامنے جانے کی جرأت سوائے حضرت اسامہ بن زیدؓ کے اور کون کر سکتا ہے کیونکہ حضرت اسامہؓ آپؐ کو بہت محبوب تھے۔ چنانچہ حضرت اسامہؓ نے آپؐ سے بات کی۔ اس پر رسولؐ اللہ کا چہرہ متغیر ہو گیا اور آپؐ نے فرمایا: تم سے پہلے لوگ اسی لیے تو ہلاک ہوئے کہ ان میں سے اگر بااثر آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے' اور جب کمزور چوری کرتا تو اس پر حد جاری کر دیتے تھے۔ خدا کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا (مشکوٰۃ)۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں پوری بات کو بڑے اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے:

امر بالمعروف و نہی عن المنکر ایک ایسا جامع اور ہمہ گیر فریضہ ہے جس پر پورے دین کی اساس قائم ہے۔ اس کام کو نظرانداز کر دینا اور ترک کر دینا نبوت کو معطل کر دینا ہے۔ یہ دین کے نظام کو ضائع

کر دینا اور دیانت کو ختم کر دینا ہے۔ یہ ایسی صورت حال ہے جس میں جہالت و فساد کا پھیل جانا اور انسانی معاشرے کا تباہ ہو جانا یقینی ہے۔

آج ہمارا ملک جس ظلم و تعدی' ناانصافی اور بددیانتی' لوٹ مار اور حقوق کی پامالی کا شکار ہے' اس کے نتیجے میں فساد و انتشار اور بے چینی و اضطراب کا ایک طوفان امڈا چلا آ رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے غفلت ہے۔ ساتھ ہی انصاف سے بے پروائی' ظالموں اور غاصبوں کو کھلی چھوٹ' بڑوں اور طاقت وروں کے لیے ہر ظلم و زیادتی' حلال اور جائز اور کمزوروں اور کم حیثیت لوگوں کے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لینے کی آزادی ہے۔ اس کا حل ایک اور صرف ایک ہے: حقیقی' موثر اور بے لاگ احتساب!

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

پیپلز پارٹی کی قائد بے نظیر بھٹو اور ان کے شوہر آصف علی زرداری کو عدالت عالیہ کے احتساب بنچ نے رشوت' کمیشن کی وصولی' اختیارات کے غلط استعمال اور ملک سے باہر ناجائز طور پر رقوم وصول کرنے کے الزام میں پانچ سال قید' پانچ سال کے لیے اسمبلی کی رکنیت اور سرکاری عہدے سے نااہلی اور جرمانے کی سزا دی ہے۔ اس پر حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے درمیان لفظی جنگ کا ایک طوفان بپا کیا جا رہا ہے اور بڑی حد تک سیاسی' گروہی اور علاقائی عصبیت کی زبان میں ایک دوسرے پر یلغار کی جا رہی ہے۔ بحث و گفتگو کا یہ انداز اصل جرائم سے کچھ کم مجرمانہ نہیں۔ یہ اللہ کے عذاب کو کھلے بندوں دعوت دینے کی جسارت ہے۔ ایک طرف یک رخے انداز میں' اپنوں کو تحفظ دیتے ہوئے صرف حزب اختلاف سے متعلق عناصر پر گرفت کا راستہ اختیار کیا گیا ہے تو دوسری طرف مقدمے کے حقائق' جرم کی اصلیت اور اس گھناؤنے فعل کی شناعت سے صرف نظر کر کے وفاق اور علاقائی عصبیت کا سہارا لے کر خود عدالت کو موضوع ہدف بنایا جا رہا ہے اور ایک ایسا سماں پیدا کیا جا رہا ہے جسے صرف چوری اور اس پر سینہ زوری ہی کہا جا سکتا ہے۔ حقائق' انصاف اور احتساب مذاق بن کر رہ گئے ہیں بلکہ صاف نظر آ رہا ہے کہ معاشرہ اور اس کے مقتدر عناصر اس حد کو پہنچ گئے ہیں جہاں معلوم ہوتا ہے کہ: ع

کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

یہ بگاڑ اور بیماری کی آخری اسٹیج ہے۔ اگر اب بھی خیر کی قوتیں حق اور انصاف کے لیے نہ اٹھ کھڑی ہوں تو ڈر ہے کہ خدا کا عذاب کہیں پورے طور پر ہمیں اپنی گرفت میں نہ لے لے (العیاذ باللہ)۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انصاف کو بے لاگ اور شفاف ہونا چاہیے اور یہ نظر بھی آنا چاہیے کہ انصاف بے لاگ اور شفاف ہو رہا ہے۔ جو نظام اس وقت قائم کیا گیا ہے' وہ ناقص ہے۔ ملک کے سنجیدہ طبقے اور خصوصیت سے اسلامی تحریک نے برملا کہا ہے کہ ایک طرف تو ہر قیادت نے لوٹ کا بازار گرم کیا ہے' دوسری طرف سبھی حکمرانوں نے اپنے اپنے دور میں اور اپنے اپنے انداز میں احتساب کو غیر موثر بنانے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ۱۹۸۸ سے ۱۹۹۶ تک چار حکومتوں کو برطرف کیا گیا جس میں سے ہر ایک کے بارے میں اور خصوصیت سے ۱۹۹۰ میں پیپلز پارٹی' ۱۹۹۳ میں مسلم لیگ اور پھر ۱۹۹۶ میں پیپلز پارٹی کی حکومتوں کے برطرف کیے جانے میں بدعنوانی' اختیارات کے ناجائز استعمال اور قومی خزانے کو لوٹنے کا الزام سرفہرست تھا۔ کم از کم ۱۹۹۶ کی بے نظیر حکومت کی چارج شیٹ تو اس کے اپنے نامزد کردہ صدر کی طرف سے آئی تھی اور عدالت عظمیٰ نے (جس کا چیف جسٹس بے نظیر صاحبہ کے صوبے سے تھا اور انھی کا مقرر کردہ تھا) بدعنوانی اور کرپشن کے الزامات کی بہ نظر ظاہر (prima facie) توثیق کی تھی۔ اس حکومت کی برطرفی جماعت اسلامی کی ملک گیر تحریک احتساب اور اسلام آباد کے دھرنے (جون ۱۹۹۶) کے بعد واقع ہوئی تھی۔ پوری قوم کا مطالبہ تھا کہ انتخاب سے پہلے احتساب ہو لیکن اسے نظرانداز کیا گیا اور پورے سیاسی عمل کو مزید بگاڑ کی راہ پر دھکیل دیا گیا۔

اس وقت کے صدر مملکت اور ان کی عبوری حکومت نے جو فاش غلطی کی اور ایک تاریخی موقع کو محض سیاسی مصالح اور نام نہاد خطرات کی بنا پر ضائع کر دیا' اس کی تلافی مشکل ہے۔ وہ احتساب کا بہترین وقت تھا اور ایک غیر جانب دار قومی انتظام میں سپریم کورٹ سے رہنمائی لے کر یہ کام موثر انداز میں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد ہی انتخابات اور دستور کی دفعہ ۶۲۔ ۶۳ کے مطابق نئی قیادت ابھر سکتی تھی۔ عبوری حکومت نے خود اپنے بنائے ہوئے احتساب آرڈی ننس میں ترمیم کر کے' ملک کا خزانہ لوٹنے والوں کو دوبارہ اسمبلیوں پر براجمان ہونے کا موقع دیا۔ گذشتہ دو اڑھائی سالوں میں یہ بالکل واضح ہو گیا ہے کہ بددیانت قیادت نے حالات کو مزید بگاڑا ہے اور حقیقی احتساب کے بغیر اصلاح کا کوئی امکان نہیں۔

اس میں ذرا برابر شک و شبہ نہیں کہ بے نظیر صاحبہ' ان کی حکومت اور موجودہ حکومت' خصوصیت سے وزیراعظم اور ان کا خاندان کھلی کھلی بدعنوانیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ یہ قوم کے مجرم ہونے کی حیثیت سے قیادت کے ہرگز مستحق نہیں۔ ان میں سے کسی کا دامن پاک نہیں اور ایک دوسرے کو چور کہنے والے سب ہی چوروں کے ٹولے میں شامل ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے نہ پروپیگنڈے کے طوفان سے آنکھوں سے اوجھل کیا جا سکتا ہے اور نہ قانونی اور فنی موشگافیوں سے ان پر پردہ ڈالا جا سکتا ہے۔ ایس جی ایس اور کوٹیکنا (Cotecna) کے جن مقدمات میں سزا ہوئی ہے وہ بارش کا پہلا قطرہ' جرائم کے پہاڑ کا

صرف ایک سرا اور انگریزی محاورے میں tip of the Iceberg ہیں۔ جس شخص نے حالات کا کچھ بھی مطالعہ کیا ہے' وہ اس معاملے میں سابق وزیراعظم اور ان کے شوہر کے کردار سے انکار نہیں کر سکتا۔ عدالت کے فیصلے میں ساری کڑیاں ایک تسلسل کے ساتھ پیش کر دی گئی ہیں۔ خود سینیٹ کی مالی کمیٹی نے' جس کے سربراہ کی حیثیت سے راقم کو مسئلے کا جائزہ لینے کا موقع ملا تھا' صاف محسوس کیا تھا کہ معاملے میں سخت گھپلا ہے۔ واضح رہے کہ سینیٹ کی کمیٹی میں پیپلزپارٹی سمیت ساری سیاسی پارٹیوں کے سینیٹر شامل تھے اور اس نے سینیٹ میں پیش کردہ اپنی ۱۷ مارچ ۱۹۹۷ کی رپورٹ میں مزید تحقیق کا مطالبہ کیا تھا' شدید بے ضابطگیوں کی نشان دہی کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ جو دستاویزات ہمارے سامنے پیش کی گئی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کمپنیوں کا ایک اہم سیاسی شخصیت سے گہرا تعلق اور ربط تھا۔

افسوس کا مقام ہے کہ ایک ایسے صاف اور واضح معاملے کو بھی قانونی موشگافیوں میں الجھایا جا رہا ہے حالانکہ درست رویہ یہ تھا کہ اپنی غلطی کا اعتراف کیا جاتا جیسا کہ کوریا کے سابق صدر' جاپان کے سابق وزیراعظم' اٹلی کے سابق وزیراعظم اور خود امریکہ کے ایک سابق نائب صدر اگینو نے کیا تھا۔ یہ ہماری سیاسی قیادت' سیاسی جماعتوں اور بحیثیت مجموعی معاشرے کے اخلاقی انحطاط کا ثبوت ہے کہ کھلے کھلے مجرم سینہ زوری کا راستہ اختیار کر رہے ہیں اور قوم ہی نہیں' انصاف کی آنکھوں میں بھی دھول جھونکنے میں اپنی نجات اور راہ فرار دیکھ رہے ہیں۔ ملک کے قانون اور عدالتی نظام کو مجرموں کو سزا دلوانے کے لیے نہیں' تحفظ فراہم کرنے کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جتنا یہ ضروری ہے کہ کوئی بے گناہ سزا نہ پائے' اتنا ہی اہم یہ بھی ہے کہ حقیقی مجرم محض قانونی موشگافیوں اور سیاسی بلیک میلنگ کے سہارے قانون کی گرفت سے نہ بچ نکلیں۔ دونوں صورتوں میں انصاف کا خون ہوتا ہے اور معاشرہ ظالموں اور غاصبوں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ نہیں ہو سکتا۔

اس دلیل میں بھی کوئی وزن نہیں کہ چونکہ دوسرے چور پکڑے نہیں جا رہے ہیں اس لیے جو چور پکڑے گئے ہیں ان کو بھی چھوڑ دیا جائے یا گرفت میں نہ لیا جائے۔ مجرموں کو بچانے کے لیے جس طرح وفاق کی دہائی دی جا رہی ہے اور صوبائی عصبیتوں کو بھڑکایا جا رہا ہے' یہ ملک اور قوم کے ساتھ غداری اور اس کی زخموں پر نمک پاشی کے مترادف ہے۔ جرم جرم ہے خواہ اس کا ارتکاب کرنے والا لاڑکانہ سے ہو یا لاہور اور رائے ونڈ سے۔ پاکستان ایک ملک ہے جس میں مجرم کہیں کا بھی ہو' اسے ہر جگہ قانون کی گرفت میں لیا جا سکتا ہے۔ خود عدالت عالیہ ذوالفقار علی بھٹو کے زمانے میں بزنجو کے مقدمے میں یہ اصول طے کر چکی ہے کہ صوبائی اور علاقائی تقسیم قانون کی گرفت کے لیے رکاوٹ نہیں بن سکتیں لیکن محض اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے آج ان تمام تعصبات کو ہوا دی جا رہی ہے۔ بلاشبہ انصاف ہر ایک کے ساتھ ہونا

چاہیے لیکن ان بودے سہاروں سے مجرموں کو قانونی گرفت سے نکلنے کا موقع دینا ایک ایسا جرم ہو گا جو پورے ملک کے نظام اور اس کی وحدت و سالمیت کو پارہ پارہ کر سکتا ہے۔ اصل مسئلہ ایک اور صرف ایک ہے----- قوم کی دولت کو لوٹا گیا ہے یا نہیں؟ اختیارات کا غلط استعمال کیا گیا ہے یا نہیں؟ اور اگر ہوا ہے----- اور لازماً ہوا ہے----- تو پھر کسی کو بھی قانون کی گرفت اور احتساب کی پکڑ سے فرار کا موقع نہیں ملنا چاہیے اور قوم کو یک آواز ہو کر تمام مجرموں اور لوٹنے والوں کے احتساب کا مطالبہ کرنا چاہیے۔

ہمارا موجودہ عدالتی نظام نہایت ناقص ہے۔ اس میں انصاف کے قیام میں غیر معمولی تاخیر ہو جاتی ہے اور مقدموں کو لٹکانے اور طول دینے کے ایسے ایسے حربے استعمال کیے جاتے ہیں کہ انصاف شرمسار ہو کر رہ جاتا ہے۔ احتساب بنچ میں ایک مقدمے کے فیصلے کے لیے ۶۰ دن کی مہلت مقرر ہے۔ بے نظیر صاحبہ کا صرف یہ ایک ریفرنس ایک سال ڈیڑھ مہینے تک چلا ہے۔ اس کے باوجود ان کے وکیل کا اصرار ہے کہ اسے دفاع کا موقع نہیں ملا۔ ججوں کے رشتے داروں کا کچا چٹھا پیش کیا جا رہا ہے اور وہ بھی مقدمے کے بالکل آخری مرحلے پر----- ہم انفرادی معاملات پر بات نہیں کرنا چاہتے۔ اخبارات میں یہ بھی شائع ہوا ہے کہ اگر ایک جج صاحب کا بھائی مسلم لیگ کا عہدے دار ہے تو اسی جج کا ایک بہنوئی پی پی پی کا عہدے دار ہے اور دوسرا اس کی حلیف مسلم لیگ کے سابق وزیر خارجہ کا۔ نیز اس بنچ کا دوسرا جج مسند عدالت پر سرفراز ہونے سے پہلے پی پی پی کا سرگرم رکن تھا' لیکن ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے' صرف یہ چاہتے ہیں کہ عدالت فی الحقیقت غیر جانب دار ہو' انصاف کرے اور انصاف ہوتا نظر آئے۔ نہ وقت ضائع کرنے کا موقع دیا جائے اور نہ مجرموں کو محض قانونی حیلوں اور کھیل کرتب کے بل بوتے پر فرار کی کوئی راہ ملے۔

احتساب کا موجودہ نظام بھی ناقص ہے۔ خصوصیت سے جن ترامیم کے ذریعے ۱۹۹۰ سے پہلے کی تمام بداعمالیوں کو تحفظ دیا گیا ہے اور جس طرح احتساب کمیشن کو وزیراعظم کے دفتر میں قائم احتساب بیورو کی گرفت میں دے دیا گیا ہے' یہ حق و انصاف کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احتساب یک طرفہ ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ موجودہ حکومت اور اس کے اکابر کو جس طرح کا تحفظ دیا جا رہا ہے' وہ ایک ظالمانہ اقدام ہے۔ شریف فیملی نے جس طرح صنعتی ایمپائر بنائی ہے' دس ارب روپے کے بنک کے نادہندہ ہیں' اس پر پردہ ڈالنے کے لیے چند بیمار صنعتوں کو بنکوں کو دینے کا اعلان کھلم کھلا دھوکا ہے۔ رائے ونڈ کے محلات' لندن کی عدالت سے ۳۲ ملین ڈالر کی ڈگری' چینی کی برآمد پر ناجائز کمائی' پنجاب کی وزارت اعلیٰ کے زمانے کی بدعنوانیاں اور خصوصیت سے پلاٹوں کی رشوت----- یہ سب اسی طرح قابل مواخذہ ہیں جس طرح بے نظیر اور زرداری کی رشوت ستانیاں اور بدعنوانیاں۔

صاف ظاہر ہے کہ یہ کام نہ موجودہ احتساب بیورو کر سکتا ہے اور نہ احتساب کمیشن ہی خود کو اس پوزیشن میں پاتا ہے کہ حقیقی احتساب کر سکے۔ کمیشن کے پاس ۳۵۰۰ شکایات موصول ہوئی ہیں جن میں سے ۱۴۰۰ مرکزی وزرا اور حکام اور ۶۵۰ صوبائی حکمرانوں کے خلاف ہیں۔ کمیشن صرف ۳۴۰ معاملات کا جائزہ لے سکا ہے اور ان میں سے ۲۴۵ احتساب بیورو کو تفتیش کے لیے بھیج دیے گئے ہیں --- اللہ اللہ خیر صلا!

اس رنگ ڈھنگ سے حقیقی احتساب کیسے ممکن ہے! یہی وجہ ہے کہ لوگ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ "چور بنے ہیں چوکیدار!"

حقیقی احتساب کے لیے مناسب ترین صورت تو یہی ہے کہ ایک ایسی قومی عبوری حکومت وجود میں آئے جس کا کام ایک متعین مدت میں فوری اور بے لاگ احتساب ہو۔ تیرھویں دستوری ترمیم کے بعد عبوری قومی حکومت کے قیام میں جو مشکلات ہیں ان کا حل سپریم کورٹ کو ریفرنس کے ذریعے تلاش کیا جا سکتا ہے۔

دونوں بڑی پارٹیوں کا دامن سیاہ ہے اور ان کے ہاتھوں انصاف ممکن نہیں۔ اس لیے اصلاح کا موثر راستہ یہی ہو سکتا ہے کہ ایک عبوری نظام بنایا جائے اور اس میں سپریم کورٹ کے موجودہ یا سابق ججوں پر مشتمل احتساب کورٹ بنائی جائے جو ایک مقررہ وقت میں بڑے بڑے معاملات کا فیصلہ کر دے۔ اس کے لیے انصاف کے تمام ضروری تقاضوں کو پورا کرنے والا ایک ایسا نظام بنایا جا سکتا ہے جو آسان ہو، جس میں ہر فریق کو اپنے دفاع کا مناسب موقع بھی مل جائے لیکن وقت گزاری اور قانونی فرار کی ہر راہ کو بند کر دیا جائے۔ نیز اس میں سزائیں بھی ایسی ہوں جو عبرتناک ہوں اور ان میں لوٹی ہوئی دولت کی واپسی کو یقینی بنایا جائے۔ تفتیش کا نظام غیر جانب دار احتساب کا حصہ ہو۔ اس سلسلے میں ایک نسبتاً آسان راستہ یہ اختیار کیا جا سکتا ہے کہ:

۱۔ ۱۹۸۵ سے اب تک جتنے افراد بھی قومی یا صوبائی اسمبلیوں اور سینیٹ کے ممبر رہے ہیں ان سب کو ایک مقررہ مدت کے اندر اپنے اور اپنے خاندان کے ملک اور بیرون ملک تمام اثاثے، پوری تفصیل کے ساتھ فراہم کرنے کا حکم دیا جائے۔ یہی مطالبہ تمام بڑے سرکاری افسروں اور پبلک سیکٹر کے اداروں کے ذمہ داروں سے بھی کیا جائے۔

۲۔ ان معلومات کو شائع کیا جائے اور پبلک کو دعوت دی جائے کہ اگر ان کے علم میں کسی کے پوشیدہ اثاثے ہوں تو ان کی نشان دہی کریں۔

۳۔ اگر کسی نے اپنے اثاثوں کو چھپایا ہے اور تفتیش پر مزید اثاثے معلوم ہو جائیں تو ایسے تمام

اثاثوں کو ضبط کیا جائے اور متعلقہ افراد کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

۴۔ جن اثاثوں کا اعلان ہو، کمیشن ان کا جائزہ لے اور جہاں اثاثے معلوم وسائل آمدنی کے مطابق نہ ہوں، وہاں متعلقہ افراد کو اپنی دولت کا جواز پیش کرنے کا موقع دیا جائے۔ بجائے اس کے کہ خیانت ثابت کرنے کے چکر میں پڑا جائے، صاحب دولت و ثروت کو اپنی دولت اور اثاثہ جات کے برحق ہونے کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے کہا جائے۔ یہ اسلام کے اس اصول کے مطابق ہو گا کہ حضرت عمرؓ سے ان کے لباس کے بارے میں سوال ہوا تھا کہ وہ جواز پیش کریں کہ یہ کیسے ان کے پاس آیا؟ اسی اصول پر اسلامی تاریخ میں خصوصیت سے خلفاے راشدین کے زمانے میں عمال کا احتساب ہوتا تھا۔ آج بھی یہی راستہ اختیار کیا جائے مگر کھلے احتساب کے ذریعے تاکہ ایک طرف لوگ اپنے اثاثوں کو پوشیدہ نہ رکھ سکیں اور دوسری طرف انھیں خود اپنی دولت و ثروت کا جواز پیش کرنا پڑے۔

۵۔ ہر فرد کو یہ موقع دیا جائے کہ اگر حکمرانوں کے بارے میں اس کے پاس کسی بڑی بدعنوانی کا ثبوت اور معلومات ہوں تو کمیشن کو فراہم کرے۔ کمیشن اپنے آزاد ذرائع سے ان کی تحقیق و تفتیش کرائے۔ یہ سلسلہ وقتی ضرورت کو پورا کرنے کے بعد ایک مستقل احتساب کا نظام بن جائے جو حکومت کی مشینری سے مکمل طور پر آزاد ہو کر خود اپنے انتظامی اور تفتیشی مشینری سے کام لے اور مالی طور پر مکمل طور پر آزاد ہو۔ اس کمیشن کے ارکان کے لیے بھی ایک مدت مقرر ہو اور ریٹائرمنٹ کے بعد کسی منفعت بخش منصب کو ان کے لیے ممنوع قرار دیا جائے۔

ایسا ایک نظام ہی وقتی اور بالآخر مستقل احتساب کی ذمہ داریوں کو کماحقہ ادا کر سکے گا اور اس طرح ملک کی اجتماعی زندگی اس گندگی اور فساد سے پاک ہو سکے گی جو ہمیں گھن کی طرح کھا رہا ہے اور جس سے نجات حاصل کیے بغیر صحت مند زندگی اور ترقی کی کوئی راہ نظر نہیں آ رہی۔

حکمت مودودیؒ

تاریخ ساز' انقلاب انگیز

انسانی تاریخ کے منظر میں اس حیرت انگیز انسان کی بلند و بالا شخصیت اتنی اُبھری ہوئی نظر آتی ہے کہ ابتدا سے لے کر اب تک کے بڑے سے بڑے تاریخی انسان جن کو دنیا اکابر (heroes) میں شمار کرتی ہے' جب اس کے مقابلے میں لائے جاتے ہیں تو اس کے آگے بونے نظر آتے ہیں۔ دنیا کے اکابر میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے کمال کی چمک دمک انسانی زندگی کے ایک دو شعبوں سے آگے بڑھ سکی ہو۔ کوئی نظریات کا بادشاہ ہے مگر عملی قوت نہیں رکھتا۔ کوئی عمل کا پتلا ہے مگر فکر میں کمزور ہے۔ کسی کے کمالات سیاسی تدبیر تک محدود ہیں۔ کوئی محض فوجی ذہانت کا مظہر ہے۔ کسی کی نظر اجتماعی زندگی کے ایک پہلو پر اتنی زیادہ گہری جمی ہے کہ دوسرے پہلو او جھل ہو گئے ہیں۔ کسی نے اخلاق اور روحانیت کو لیا تو معیشت و سیاست کو بھلا دیا۔ کسی نے معیشت و سیاست کو لیا تو اخلاق و روحانیت کو نظرانداز کر دیا۔ غرض تاریخ میں ہر طرف یک رخے ہیرو ہی نظر آتے ہیں۔ مگر تنہا یہی ایک شخصیت ایسی ہے جس میں تمام کمالات جمع ہیں۔ وہ خود ہی فلسفی اور حکیم بھی ہے۔ اور خود ہی اپنے فلسفہ کو عملی زندگی میں نافذ کرنے والا بھی۔ وہ سیاسی مدبر بھی ہے' فوجی لیڈر بھی ہے' واضع قانون بھی ہے' معلم اخلاق بھی ہے' مذہبی اور روحانی پیشوا بھی ہے۔ اس کی نظر انسان کی پوری زندگی پر پھیلتی ہے اور چھوٹی چھوٹی تفصیلات تک جاتی ہے۔ کھانے اور پینے کے آداب اور جسم کی صفائی کے طریقوں سے لے کر بین الاقوامی تعلقات تک ایک ایک چیز کے متعلق وہ احکام اور ہدایات دیتا ہے' اپنے نظریات کے مطابق ایک مستقل تہذیب (civilization) وجود میں لا کر دکھا دیتا ہے اور زندگی کے تمام مختلف پہلوؤں میں ایسا صحیح توازن (equilibrium) قائم کرتا ہے کہ افراط و تفریط کا کہیں نشان تک نظر نہیں آتا۔ کیا اس جامعیت کا کوئی دوسرا شخص تمھاری نظر میں ہے؟

دنیا کی بڑی بڑی تاریخی شخصیتوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو کم و بیش اپنے ماحول کی پیدا کردہ نہ ہو' مگر اس شخص کی شان سب سے نرالی ہے۔ اس کے بنانے میں اس کے ماحول کا کوئی حصہ نظر نہیں آتا' اور نہ کسی دلیل سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ عرب کا ماحول اس وقت تاریخی طور پر ایسے ایک انسان کی پیدائش کا مقتضی تھا۔ بہت کھینچ تان کر تم جو کچھ کہہ سکتے ہو وہ اس سے زیادہ کچھ نہ ہو گا کہ تاریخی اسباب عرب میں ایک ایسے لیڈر کے ظہور کا تقاضا کرتے تھے جو قبائلی انتشار کو مٹا کر ایک قوم بناتا' اور ممالک کو فتح کر کے عربوں کی معاشی فلاح و بہبود کا سامان کرتا--- یعنی ایک نیشنلسٹ لیڈر جو اس وقت کی تمام

عربی خصوصیات کا حامل ہوتا۔ ظلم، بے رحمی، خوں ریزی اور مکر و دغا، غرض ہر ممکن تدبیر سے اپنی قوم کو خوش حال بناتا اور ایک سلطنت پیدا کر کے اپنے پسماندوں کے لیے چھوڑ جاتا۔ اس کے سوا اس وقت کی عربی تاریخ کا کوئی تقاضا تم ثابت نہیں کر سکتے۔ ہیگل کے فلسفہ تاریخ یا مارکس کی مادی تعبیر، تاریخ کے نقطۂ نظر سے تم حد سے حد یہی حکم لگا سکتے ہو کہ اس وقت اس ماحول میں ایک قوم اور ایک سلطنت بنانے والا ظاہر ہونا چاہیے تھا، یا ظاہر ہو سکتا تھا۔ مگر ہیگلی یا مارکسی فلسفہ اس واقعے کی توجیہ کیونکر کرے گا کہ اس وقت اس ماحول میں ایسا شخص پیدا ہوا جو بہترین اخلاق سکھانے والا، انسانیت کو سنوارنے اور نفوس کا تزکیہ کرنے والا اور جاہلیت کے اوہام و تعصبات کو مٹانے والا تھا، جس کی نظر قوم اور نسل اور ملک کی حدیں توڑ کر پوری انسانیت پر پھیل گئی، جس نے اپنی قوم کے لیے نہیں بلکہ عالم انسانی کے لیے ایک اخلاقی و روحانی اور تمدنی و سیاسی نظام کی بنا ڈالی۔ جس نے معاشی معاملات اور سیاست مدن اور بین الاقوامی تعلقات کو عالم خیال میں نہیں بلکہ عالم واقعہ میں اخلاقی بنیادوں پر قائم کر کے دکھایا اور روحانیت و مادیت کی ایسی معتدل اور متوازن آمیزش کی جو آج بھی حکمت و دانائی کا ویسا ہی شاہکار ہے جیسا اس وقت تھا۔ کیا ایسے شخص کو تم عرب جاہلیت کے ماحول کی پیداوار کہہ سکتے ہو؟

یہی نہیں کہ وہ شخص اپنے ماحول کی پیداوار نظر نہیں آتا، بلکہ جب ہم اس کے کارنامے پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے۔ اس کی نظر وقت اور حالات کی بندشوں کو توڑتی ہوئی صدیوں اور ہزاریوں (millenniums) کے پردوں کو چاک کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ وہ انسان کو ہر زمانے اور ہر ماحول میں دیکھتا ہے اور اس کی زندگی کے لیے ایسی اخلاقی اور عملی ہدایات دیتا ہے جو ہر حال میں یکساں مناسبت کے ساتھ ٹھیک بیٹھتی ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہے جن کو تاریخ نے پرانا کر دیا ہے، جن کی تعریف ہم صرف اس حیثیت سے کر سکتے ہیں کہ اپنے زمانے کے اچھے رہنما تھے۔ سب سے الگ اور سب سے ممتاز، وہ انسانیت کا ایسا رہنما ہے جو تاریخ کے ساتھ حرکت (march) کرتا ہے اور ہر دور میں ویسا ہی جدید (modern) نظر آتا ہے جیسا اس سے پہلے دور کے لیے تھا۔

تم جن لوگوں کو فیاضی کے ساتھ "تاریخ بنانے والے" (makers of history) کا لقب دیتے ہو وہ حقیقت میں تاریخ کے بنائے ہوئے (creatures of history) ہیں۔ دراصل تاریخ بنانے والا پوری انسانی تاریخ میں صرف یہی ایک شخص ہے۔ دنیا کے جتنے لیڈروں نے تاریخ میں انقلاب برپا کیے ہیں، ان کے حالات پر تحقیقی نگاہ ڈالو۔ تم دیکھو گے کہ ہر ایسے موقع پر پہلے سے انقلاب کے اسباب پیدا ہو رہے تھے، اور وہ اسباب خود ہی اس انقلاب کا رخ اور راستہ بھی معین کر رہے تھے جس کے برپا ہونے کے وہ مقتضی تھے۔ انقلابی لیڈر نے صرف اتنا کیا کہ حالات کے اقتضا کو قوت سے فعل میں لانے کے لیے اس ایکٹر کا پارٹ ادا کر دیا جس کے لیے اسٹیج اور کام دونوں پہلے سے معین ہوں۔ مگر تاریخ بنانے والوں یا انقلاب برپا

کرنے والوں کی پوری جماعت میں یہ اکیلا ایسا شخص ہے کہ جہاں انقلاب کے اسباب موجود نہ تھے' وہاں اس نے خود اسباب کو پیدا کیا' جہاں انقلاب کا مواد موجود نہ تھا' وہاں اس نے خود مواد تیار کیا' جہاں اس انقلاب کی اسپرٹ اور عملی استعداد لوگوں میں نہ پائی جاتی تھی' وہاں خود اس نے اپنے مطلب کے آدمی تیار کیے' اپنی زبردست شخصیت کو پگھلا کر ہزارہا انسانوں کے قالب میں اتار دیا اور ان کو ویسا بنایا جیسا وہ بنانا چاہتا تھا۔ اس کی طاقت اور قوت ارادی نے خود ہی انقلاب کا سامان کیا' خود ہی اس کی صورت اور نوعیت معین کی اور خود ہی اپنے ارادے کے زور سے حالات کی رفتار کو موڑ کر اس راستے پر چلایا جس پر وہ اسے چلانا چاہتا تھا۔

اس شان کا تاریخ ساز اور اس مرتبے کا انقلاب انگیز تم کو اور کہاں نظر آتا ہے؟

آیئے اب اس سوال پر غور کیجیے کہ ۱۴ سو برس پہلے کی تاریک دنیا میں' عرب جیسے تاریک تر ملک کے ایک گوشے میں ایک گلہ بانی اور سوداگری کرنے والے اَن پڑھ' بادیہ نشین کے اندر یکایک اتنا علم' اتنی روشنی' اتنی طاقت' اتنے کمالات' اتنی زبردست تربیت یافتہ قوتیں پیدا ہو جانے کا کون سا ذریعہ تھا۔

دیکھو' وہ خود کیا کہہ رہا ہے۔ وہ اپنے کمالات میں سے ایک کا کریڈٹ بھی خود نہیں لیتا۔ کہتا ہے میں ایک انسان ہوں' تم ہی جیسا انسان۔ میرے پاس کچھ بھی اپنا نہیں۔ سب کچھ خدا کا ہے اور خدا ہی کی طرف سے ہے۔ یہ کلام جس کی نظیر لانے سے تمام نوع انسانی عاجز ہے میرا کلام نہیں ہے' میرے دماغ کی قابلیت کا نتیجہ نہیں ہے' لفظ بلفظ خدا کی طرف سے میرے پاس آیا ہے اور اس کی تعریف خدا ہی کے لیے ہے۔ یہ کارنامے جو میں نے دکھائے' یہ قوانین جو میں نے وضع کیے' یہ اصول جو میں نے تمھیں سکھائے' ان میں سے کوئی چیز بھی میں نے خود نہیں گھڑی ہے۔ میں کچھ بھی اپنی ذاتی قابلیت سے پیش کرنے پر قادر نہیں ہوں۔ ہر ہر چیز میں خدا کی رہنمائی کا محتاج ہوں۔ ادھر سے جو اشارہ ہوتا ہے وہی کرتا ہوں اور وہی کہتا ہوں۔

سچائی کی اس سے زیادہ کھلی ہوئی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس شخص سے زیادہ سچا اور کون ہو گا جس کو ایک نہایت مخفی ذریعے سے ایسے بے نظیر کمالات حاصل ہوں' اور وہ بلاتکلف اپنے اصلی ماخذ کا حوالہ دے دے؟

بتاؤ کیا وجہ ہے کہ ہم اس کی تصدیق نہ کریں؟

(ترجمان القرآن' شوال ۵۵ھ' جنوری ۳۷ء)

علم سے موتی — رہنما تحقیق

اسلامک پبلی کیشنز کی خاص پیشکش

امام العصر سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی سدا بہار تحریروں کا انتخاب

"افکارِ اعلیٰ" سیریز

- دعوتِ دین کی بنیادیں
- عبادت کی حقیقت
- ہماری دعوت کیا ہے
- ایمان اور اطاعت
- مسلمان کی طاقت کا اصل راز
- زندگی کا نصب العین
- اسلام کا تصورِ زندگی
- اسلام کا نظامِ معیشت
- اسلام اور رواداری
- تقدیر کیا ہے
- اسلام کی دعوت
- عبادت کیا ہے
- خلافت کیا ہے
- لباس کیسا ہونا چاہئے
- امر بالمعروف و نہی عن المنکر
- قومیت کا اسلامی تصور
- اسلام کیسا مذہب ہے
- ہدایت و گمراہی کا راز
- اسلام میں عبادت کا تصور
- تعمیر سیرت کے اوصاف
- تزکیۂ نفس
- اسلامی نظامِ تعلیم
- قرآن کی معاشی تعلیمات
- نماز — دین کا ستون
- اسلامی انقلاب کے لیے ضروری اوصاف

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳-ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

فون: 7664504-7669546 فیکس: 7658674 e-mail: islamic@ms.net.pk

نصرت الٰہی: ماقبل مراحل

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ط مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ط اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ٥ (البقرہ ۲: ۲۱۴) پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمھیں مل جائے گا' حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے' جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے؟ ان پر سختیاں گزریں' مصیبتیں آئیں' ہلا مارے گئے' حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی--- اس وقت انھیں تسلی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔

امام' امام الدین اسماعیل ابن کثیر دمشقیؒ

مطلب یہ ہے کہ آزمایش اور امتحان سے پہلے جنت کی آرزوئیں ٹھیک نہیں۔ اگلی تمام امتوں کا بھی امتحان لیا گیا' انھیں بھی بیماریاں اور مصیبتیں پہنچیں' بَاسَآءُ کے معنی فقیری اور ضَرَّآءُ کے معنی بیماری بھی کیا گیا ہے۔ ان پر دشمنوں کا خوف اس قدر طاری ہوا کہ بیچارے کانپنے لگے۔ ان تمام سخت امتحانوں میں وہ کامیاب ہوئے اور جنت کے وارث بنے۔ صحیح حدیث میں ہے ایک مرتبہ حضرت خبابؓ بن ارت نے کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپؐ ہماری امداد کی دعا نہیں کرتے؟ آپؐ نے فرمایا: بس ابھی سے گھبرا اٹھے۔ سنو! تم سے اگلے مؤحّدوں کو پکڑ کر ان کے سروں پر آرے رکھ دیے جاتے تھے اور چیر کر ٹھیک دو ٹکڑے کر دیے جاتے تھے لیکن وہ توحید و سنت سے نہ ہٹتے تھے' لوہے کی کنگھیوں سے ان کے گوشت پوست نوچے جاتے تھے لیکن [وہ] دین خدا کو نہیں چھوڑتے تھے۔ قسم خدا کی! اس میرے دین کو تو میرا رب اس قدر پورا کرے گا کہ بلاخوف و خطر صنعاء سے حضرموت تک کا سفر ایک ایک سوار کرنے لگے گا۔ اسے سوائے خدا کے کسی کا خوف نہ ہو گا' البتہ دل میں یہ خیال ہونا اور بات ہے کہ کہیں میری بکریوں پر بھیڑیا نہ پڑے لیکن افسوس تم جلدی کرتے ہو۔

قرآن میں ٹھیک یہی مضمون دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: الٓمّٓ ٥ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا الخ (العنکبوت ۲۹: ۱-۲) کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ محض ایمان کے اقرار سے ہی چھوڑ دیے

جائیں گے اور ان کی آزمایش نہ ہوگی۔ ہم نے اگلوں کی بھی آزمایش کی۔ سچوں کو اور جھوٹوں کو یقیناً ہم نتھار کر رہیں گے۔ چنانچہ اسی طرح صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی پوری آزمایش یوم الاحزاب کو (یعنی جنگ خندق میں) ہوئی جیسے خود قرآن پاک نے اس کا نقشہ کھینچا ہے۔ فرمان ہے: اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ الخ (الاحزاب ۳۳: ۱۰) یعنی جب کہ کافروں نے تمھیں اوپر نیچے سے گھیر لیا' جب کہ آنکھیں پتھرا گئیں' دل حلقوم تک آگئے اور خداے تعالیٰ کے ساتھ گمان ہونے لگے۔ اس جگہ مومنوں کی پوری آزمایش ہوگئی اور وہ خوب جھنجھوڑ دیے گئے' جب کہ منافق اور ڈھل مل یقین لوگ کہنے لگے کہ خدا رسول کے وعدے تو غرور کے ہی تھے الخ۔ ہرقل نے جب ابوسفیان سے ان کے کفر کی حالت میں پوچھا تھا کہ تمھاری کوئی لڑائی بھی اس دعوے دار نبوت سے ہوئی ہے؟ ابوسفیان نے کہا: ہاں۔ پوچھا پھر کیا رنگ رہا؟ کہا: کبھی ہم غالب رہے' کبھی وہ غالب رہے۔ تو ہرقل نے کہا: انبیا کی اسی طرح آزمایش ہوتی رہتی ہے لیکن انجام کار کھلا غلبہ انھی کا ہوتا ہے---- اگلے مومنوں نے مع نبیوں کے ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ کی مدد طلب کی اور سختی اور تنگی سے نجات چاہی جنھیں جواب ملا کہ امداد خدا بہت ہی نزدیک ہے (تفسیر ابن کثیر' ج ۱' ص ۲۲۴)۔

مولانا محمود الحسنؒ

پہلے مذکور ہوا کہ دشمنوں کے ہاتھ سے انبیا اور ان کی امتوں کو ہمیشہ ایذائیں ہوئیں' تو اب اہل اسلام کو ارشاد ہے کہ کیا تم کو اس بات کی طمع ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ حالانکہ اگلی امتوں کو جو ایذائیں پیش آئیں وہ تم کو پیش نہیں آئیں کہ ان کو فقر و فاقہ اور مرض اور خوف کفار اس درجے کو پیش آئے کہ مجبور اور عاجز ہو کر نبی اور ان کی امت بول اٹھی کہ دیکھیے اللہ نے جس مدد اور اعانت کا وعدہ فرمایا تھا وہ کب آئے گی' یعنی مقتضاے بشریت پریشانی کی حالت میں مایوسانہ کلمات سرزد ہونے لگے۔ انبیا اور مومنین کا یہ کہنا کچھ شک کی وجہ سے نہ تھا بلکہ بحالت اضطرار مقتضاے بشریت اس کی نوبت آئی' جس میں کوئی ان پر الزام نہیں۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو رحمت الٰہی متوجہ ہوئی اور ارشاد ہوا کہ ہوشیار ہو جاؤ' اللہ کی مدد آگئی۔ گھبراؤ نہیں' سواے مسلمانو' تکالیف دنیوی سے اور دشمنوں کے غلبے سے گھبراؤ نہیں' تحمل کرو اور ثابت قدم رہو (تفسیر عثمانی' مطبوعہ تاج کمپنی' ص ۵۵)۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

یہ اس سنت اللہ کی طرف اشارہ ہے جس کی کسوٹی پر ہر وہ جماعت پرکھی جاتی ہے جو اصل حق کی حامل بن کر اٹھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ منافقین اور کفار کی اس مخالفت اور اس استہزا سے گھبرا نہ جاؤ' ابھی تو اس راہ عشق کی یہ ابتدا ہے' آگے اس سے کہیں کٹھن مقامات آنے ہیں' تمھیں بھی ان سارے مراحل

سے گزرنا ہے جن سے تم سے پہلے اٹھنے والے حاملین حق کو گزرنا پڑا ہے۔ تم سے پہلے جنھوں نے اس راہ میں قدم رکھے ان کو ایسے مصائب و شدائد پیش آئے اور وہ آزمایشوں کے ہاتھوں اس طرح جھنجھوڑ دیے گئے کہ رسول اور اس کے ساتھی سب مَتٰی نَصْرُ اللّٰہ پکار اٹھے۔

حَتّٰی یَقُوْلَ ہمارے نزدیک حال کے معنی میں ہے اور مقصود اس سے تصویر حال ہے۔ اور مَتٰی نَصْرُ اللّٰہ کا اسلوب اس فریاد کو ظاہر کرتا ہے جس کی نوعیت امید کے دروازے پر آخری دستک کی ہوتی ہے۔ فرمایا کہ نصرت الٰہی کا دروازہ اسی دستک کی کلید سے کھلتا ہے۔ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ ~

رہرو تشنہ لب نہ گھبرانا اب لیا چشمۂ بقا تو نے

(تدبر قرآن، ج ۱، ص ۵۰۴)

مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ

آیت سے یہ مراد نہیں کہ کوئی مومن محض ایمان کی برکت اور فضل خدا سے جنت میں داخل ہی نہ ہو سکے گا جب تک کہ مجاہدات شدیدہ کی منزل سے نہ گزرے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ صحابہؓ جن درجات عالیہ کے طالب تھے، اور بقول مرشد تھانویؒ ہر مومن کو طلب ایسی ہی رکھنی چاہیے، ان درجات عالیہ تک پہنچنے کے لیے عام شرط ان منزلوں سے گزرنے کی ہے۔ باقی نفس مجاہدہ تو ہر مومن کو اپنے درجہ و بساط کے لحاظ سے کرنا ہی ہوتا ہے۔

اَلْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ یعنی مخالفین کے ہاتھوں انھیں جو مصیبتیں جھیلنا پڑیں۔ دونوں لفظ قریب المعانی ہیں۔ فرق یہ کیا گیا ہے کہ باساء میں راحت و آسایش کے فقدان کا پہلو نمایاں ہے اور ضراء میں واقعی درد و اذیت کا۔ ان آزمایشوں کے تذکرے قدیم صحیفوں میں بھی بکثرت ملتے ہیں۔ مثلاً "صادق پر بہت سی مصیبتیں ہوتی ہیں" (زبور ۳۴:۱۹)۔ "چاندی کے لیے گھریا ہے اور سونے کے لیے بھٹی پر خداوند دلوں کو تپاتا ہے" (امثال ۱۷:۳)۔ "ضرور ہے کہ ہم بہت سی مصیبتیں سہ کر خدا کی بادشاہت میں داخل ہوں" (اعمال ۱۴:۲۲)۔

نصر اللّٰہ، یعنی نصرت موعود۔ انبیا و مومنین کا یہ قول حالت اضطرار میں دعا و مناجات کے طور پر تھا، نہ بہ طور اعتراض و شکوہ۔ وعدہ نصرت الٰہی کا تھا، مگر یہ تعین تو نہ تھا کہ کس وقت ہوگی۔ جب ہجوم شدائد ہوتا، تو نصرت غیبی کی ضرورت محسوس کرتے، اور اپنے اجتہاد سے بہ الحاح و زاری پکارتے کہ حضرت، یہی تو وقت دستگیری و نصرت غیبی کے نزول کا ہے (تھانویؒ)۔

آیت میں اشارہ ہے کہ امت محمدیؐ کو بھی ہر قسم کی بلائیں پیش آئیں گی، جیسی کہ اگلی امتوں کو پیش آچکی ہیں۔ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ، یہ جواب ان امتوں کو ان کی درخواست کا ملا کرتا۔ اس میں مومنین کو ہمیشہ کے لیے بشارت اور تسلی مل گئی اور اس حقیقت کا بیان آگیا کہ نصرت الٰہی اپنے وقت پر ضرور آکر

رہے گی۔ مجاہدات سے گھبرانا اور بددل نہ ہونا چاہیے۔ صوفیہ نے آیت سے یہ تعلیم بھی اخذ کی ہے کہ حالات مخالف کے ہجوم سے بہ تقاضاے بشریت اضطراب تو کاملین تک کو ہوتا ہے' مگر ساتھ ہی ثابت قدمی اور اتباع احکام کی برکت سے نصرت الٰہی حاصل ہو کر رہتی ہے (تفسیر ماجدی ' مطبوعہ تاج کمپنی' ص ۸۴)۔

سید قطب شہیدؒ

ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ میں سے اولین گروہ (صحابہ کرام) کو مخاطب کیا' انھیں ان سے قبل کی مومن جماعتوں کے تجربات کی طرف متوجہ کیا اور ان پر واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے جن چیدہ بندوں کے ہاتھوں میں اپنا پرچم دیتا ہے اور جن کو زمین میں اپنی امانت' اپنا نظام حیات اور اپنی شریعت سونپتا ہے' ان کی تربیت کے سلسلے میں اس کی سنت' یہی آزمایشوں کی سنت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ خطاب صحابہ کرامؓ کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ عام اور دائمی خطاب ہے' جس کے مخاطب وہ تمام لوگ ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ اس عظیم کام کے لیے منتخب فرمائے۔

یہ ایک عمیق' بزرگ اور خوف ناک تجربہ ہے۔ رسول کی جانب سے' جس کا تعلق اللہ سے بہت گہرا ہوتا ہے اور اہل ایمان کی جانب سے' جو اللہ پر پختہ یقین رکھتے ہیں' یہ سوال ہوتا ہے: مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ "اللہ کی مدد کب آئے گی!" یہ سوال اس بات کی تصویر کشی کرتا ہے کہ آزمایش اتنی شدید تھی کہ وہ دل بھی ہل گئے جو خدا سے جڑے ہوئے تھے۔ یہ الفاظ دیگر آزمایش ناقابل بیان تھی' اتنی شدید کہ جب اس کے تاثرات ایسے دلوں پر پڑتے تو ان سے یہ کرب ناک سوال ابھرتا: مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ "اللہ کی مدد کب آئے گی!"

جب دل اس ہلا دینے والی آزمایش پر ثابت قدم رہیں تو اللہ کا فیصلہ نافذ ہو جاتا ہے اور اس کی مدد آجاتی ہے: اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ "سنو! اللہ کی مدد قریب ہے!"

اللہ کی مدد ان لوگوں کے لیے موجود ہے جو اس کے مستحق ہیں۔ اس کی نصرت کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو آخر تک ثابت قدم رہیں' جو شدائد و آلام میں ثابت قدمی دکھائیں' جو ہلا ڈالنے والی مصیبتوں کے مقابلے میں چٹان ثابت ہوں' جن کے سر طوفانوں کے آگے نہ جھکیں' جنھیں اس بات کا یقین ہو کہ مدد صرف اللہ کی مدد ہے اور وہ اس وقت آتی ہے جب اللہ چاہتا ہے' اور جب آزمایش اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ وہ صرف اللہ کی نصرت کے منتظر ہوتے ہیں' کسی اور حل کے نہیں اور نہ کسی اور مدد کے' جو اللہ کی طرف سے نہ آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مدد اور نصرت اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

اس سب کے نتیجے میں اہل ایمان جنت میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ جہاد' آزمایش' صبر و ثبات' اللہ کے لیے یکسوئی و اخلاص' صرف اللہ کے تصور اور اس کے سوا ہر شے اور ہر شخصیت سے صرف نظر کے بعد جنت کے مستحق و سزاوار ہوتے ہیں۔

کشمکش اور اس میں صبر و استقامت سے نفوس کو قوت و رفعت ملتی ہے۔ مصائب و آلام کی کٹھالی میں وہ تپ تپ کر پاک صاف ہوتے اور ان کا جوہر روشن و مصفٰی ہو جاتا ہے۔ اس سے ان کے عقیدے میں گہرائی' قوت اور زندگی پیدا ہوتی ہے' یہاں تک کہ اس کی آب و تاب سے مخالفوں اور دشمنوں کی نظریں خیرہ ہو جاتی ہیں اور وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگتے ہیں--- جیسا کہ واقع ہوا اور جیسا کہ ہر حق معاملے میں ہوتا ہے۔ ابتدا میں اہل حق ہر طرح کے حالات سے دوچار ہوتے ہیں' یہاں تک کہ جب وہ آزمایش میں ثابت قدم رہتے ہیں تو ان سے جنگ کرنے والے خود ان کے دائرے میں آ جاتے ہیں اور ان کے بدترین دشمن ان کے معاون و مددگار بن جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور چیز جو حقیقت کے اعتبار سے اس سے بھی بڑھ کر ہے وہ یہ ہے کہ دعوت حق کے حاملین کی ارواح زمین کی تمام قوتوں اور اس کے تمام شرور و فتن سے بلند ہو جاتی ہیں۔ وہ سہولت پسندی و راحت طلبی ہی نہیں' آخرکار خود زندگی کی حرص سے آزاد ہو جاتی ہیں۔ یہ آزادی کمائی ہے پوری انسانیت کے لیے۔ یہ کمائی ہے ان ارواح کے لیے' جو اس تک دنیا سے بے نیازی کی راہ سے پہنچتی ہیں۔ یہ کمائی ان تمام مصائب و آلام اور شدائد و مشکلات سے--- جن سے اہل ایمان' جو اللہ کے پرچم' اس کی امانت' اس کے دین اور اس کی شریعت کے حامل ہیں' دوچار ہوتے ہیں--- زیادہ وزنی ہے۔

یہ آزادی آخرکار انسان کو جنت کا اہل بناتی ہے۔ درحقیقت یہی جنت کا راستہ ہے!

وہ راستہ کیا ہے؟ ایمان و جہاد' ابتلا و آزمایش' صبر و ثبات اور صرف اللہ کی طرف توجہ' پھر اللہ کی مدد آتی ہے۔ پھر جنت اور اس کی نعمتیں استقبال کرتی ہیں (**فی ظلال القرآن**' ج ۱' ترجمہ سید حامد علی' ص ۵۳۴)۔

مفتی محمد شفیعؒ

اس آیت میں چند باتیں قابل غور ہیں:

اول یہ کہ اس آیت سے بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بغیر مشقت و محنت کے اور بغیر مصائب و آفات میں مبتلا ہوئے کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا۔ حالانکہ ارشادات قرآنی اور ارشادات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ بہت سے گناہ گار محض اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مغفرت سے جنت میں داخل ہوں گے' ان پر کوئی مشقت بھی نہ ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ مشقت و محنت کے درجات مختلف ہیں۔ ادنیٰ درجہ نفس و شیطان سے مزاحمت کر کے یا دین حق کے مخالفین کے ساتھ مخالفت کر کے اپنے عقائد کا درست کرنا ہے اور یہ ہر مومن کو حاصل ہے۔ آگے اوسط اور اعلیٰ درجات ہیں۔ جس درجے کی محنت و مشقت ہوگی اسی درجے کا دخول جنت ہوگا۔ اس طرح محنت و مشقت سے خالی کوئی نہ رہا۔ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً اَلْاَنْبِیَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ ' سب سے زیادہ سخت بلائیں اور

مصیبتیں انبیا علیہم السلام کو پہنچتی ہیں' اُن کے بعد جو اُن کے قریب تر ہیں۔

دوسری بات یہاں قابل نظر یہ ہے کہ انبیا علیہم السلام اور ان کے ساتھیوں کا یہ عرض کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کب آئے گی کسی شک و شبہ کی وجہ سے نہ تھا جو اُن کی شان کے خلاف ہے' بلکہ اس سوال کا منشا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ مدد کا وعدہ فرمایا ہے' مگر اس کا وقت اور مقام متعین نہیں فرمایا۔ اس لیے حالت اضطرار میں ایسے الفاظ عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ مدد جلد بھیجی جائے۔ ایسی دعا کرنا توکل یا منصب نبوت کے منافی نہیں' بلکہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کی الحاح و زاری کو پسند فرماتے ہیں' اس لیے انبیا اور صلحاے امت اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں (معارف القرآن' ج ۱' ص ۵۱۰)۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ہمارے جو وعدے دنیا اور آخرت کی کامرانیوں کے لیے ہیں' کوئی شخص مجرد زبانی دعواے ایمان کر کے ان کا مستحق نہیں ہو سکتا' بلکہ ہر مدعی کو لازماً آزمایشوں کی بھٹی سے گزرنا ہو گا تاکہ وہ اپنے دعوے کی صلاحیت کا ثبوت دے۔ ہماری جنت اِتنی سستی نہیں ہے اور نہ دنیا ہی میں ہماری خاص عنایات ایسی ارزاں ہیں کہ تم بس زبان سے ہم پر ایمان لانے کا اعلان کرو اور ہم وہ سب کچھ تمھیں بخش دیں۔ ان کے لیے تو امتحان شرط ہے۔ ہماری خاطر مشقتیں اٹھانی ہوں گی۔ جان و مال کا زیاں برداشت کرنا ہو گا۔ طرح طرح کی سختیاں جھیلنی ہوں گی۔ خطرات' مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ خوف سے بھی آزمائے جاؤ گے اور لالچ سے بھی۔ ہر چیز جسے عزیز و محبوب رکھتے ہو' ہماری رضا پر اسے قربان کرنا پڑے گا' اور ہر تکلیف جو تمھیں ناگوار ہے' ہمارے لیے برداشت کرنی ہو گی۔ تب کہیں یہ بات کھلے گی کہ ہمیں ماننے کا جو دعویٰ تم نے کیا تھا وہ سچا تھا یا جھوٹا۔ یہ بات قرآن مجید میں ہر اس مقام پر کہی گئی ہے جہاں مصائب و شدائد کے ہجوم میں مسلمانوں پر گھبراہٹ کا عالم طاری ہوا ہے۔ ہجرت کے بعد مدینے کی ابتدائی زندگی میں جب معاشی مشکلات' بیرونی خطرات اور یہود و منافقین کی داخلی شرارتوں نے اہل ایمان کو سخت پریشان کر رکھا تھا' اس وقت فرمایا:

> کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تم پر وہ حالات نہیں گزرے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے (اہل ایمان) پر گزر چکے ہیں؟ ان پر سختیاں اور تکلیفیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے۔ یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے لوگ پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی (تب انھیں مژدہ سنایا گیا کہ) خبردار رہو' اللہ کی مدد قریب ہے۔ البقرہ ۲: ۲۱۴ (تفہیم القرآن' ج ۳' ص ۶۷۵)'

تمثیلات نبوی ﷺ

نصر اللہ خاں عزیزؒ ○

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کرنے کے لیے مبعوث ہوا ہوں۔ یعنی مقاصد بعثت میں سے یہ مقصد اہم ترین مقصد ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پورے دین حق کی غرض و غایت اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی کہ نوع انسانی کے اخلاق پاکیزہ ہو جائیں۔ اس لیے کہ پاکیزہ اخلاق ہی پاکیزہ اور خوش گوار اور کامران زندگی کی بنیاد ہیں۔ اگر کسی معاشرے کے اخلاق پاکیزہ ہیں' اور پاکیزگی کا معیار وہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے قائم فرما دیا ہے تو اس کے جنتی ہونے' اس کے کامیاب و کامران ہونے اور دنیا و آخرت میں فلاح یافتہ ہونے میں کیا شبہ ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ پورے دین حق اور نظام اسلامی کی غرض و غایت ہی "مکارم اخلاق" کا پیدا کرنا ہے تو کچھ بے جا نہ ہو گا۔

توحید' رسالت' آخرت' نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ' جہاد' اسلامی معاشرت' اسلامی معیشت اور اسلامی سیاست' سب اس ایک غرض کے لیے محو عمل ہیں کہ انسانوں کے اخلاق کو سنوارا جائے اور ان کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ دنیا میں امن و راحت سے زندگی بسر کریں اور آخرت میں جنت میں داخل ہونے کے حق دار ہو جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود حسن اخلاق کے پیکر کامل تھے اور اس آفتاب ہدایت سے جو شخص وابستہ ہوتا تھا' حسن اخلاق کے نور سے منور ہو جاتا تھا۔ ۲۳ سال کی مدت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پاکیزہ ریاست کو قائم فرما دیا' جو تمام پہلوؤں سے نہایت پاکیزہ اور بلند تھی' اور اس پاک باز قوم پر مشتمل تھی جس کا ہر فرد نیکی' تقویٰ' خشیت الٰہی اور ذمہ دار زندگی کا بہترین نمونہ تھا۔

قرآن مجید میں جہاں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے پروگرام کی وضاحت کی گئی ہے وہاں یعلمھم الکتب والحکمۃ فرمایا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اصلاح نفوس' تزکیہ اخلاق اور تربیت سیرت میں کمال حاصل تھا۔

○ سہ روزہ کوثر' روزنامہ تسنیم اور ہفت روزہ ایشیا کے مدیر (م ۱۹۷۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسانی نفسیات کی نبض کی ایک ایک دھڑکن کو پہچانتے تھے اور اس کے مطابق انسانوں کی تربیت فرماتے تھے۔

انسانوں کو بات سمجھانے کا ایک موثر بلکہ موثر ترین طریقہ تمثیلات کا ہے۔ تمثیل، تصورات کو مجرد کر کے انسان کے سامنے پیش کر دیتی ہے اور بات کو دل کی گہرائیوں میں اتار دیتی ہے۔ آنحضرتؐ تربیت و تذکیر کے لیے تمثیلات سے کام لیتے تھے۔ حضورؐ کی تمثیلات بھی نہایت بلند اور پاکیزہ اور مکمل ہوتی تھیں اور جس بات سے تعلق رکھتی تھیں اس کی تقریباً تمام تفصیلات پر حاوی ہوتی تھیں۔

نہر جاری میں پنج وقتہ غسل: نماز اسلامی زندگی میں جزو اعظم کی حیثیت رکھتی ہے۔ رسولؐ اللہ نے اس کو عمادالدین فرمایا ہے اور خود قرآن مجید میں جتنی تاکید اس عبادت کی آئی ہے اتنی تاکید کسی اور عبادت کی نہیں آئی۔ اس لیے کہ یہ انسانی روح کو نکھارتی، اس کو آلائشوں اور گندگیوں سے پاک کرتی اور ہمہ وقت انسان کو یہ بتاتی رہتی ہے کہ تو اللہ کا بندہ ہے اور تجھے ایک بندے کی حیثیت میں اپنی زندگی گزارنی چاہیے۔ اگر یہ احساس دن بھر میں بار بار دلایا جاتا رہے تو کوئی وجہ نہیں کہ انسانی زندگی اس سے متاثر نہ ہو۔ اس حقیقت کو آنحضرتؐ نے ایک تمثیل سے عیاں فرمایا۔ صحابہؓ سے ارشاد ہوا کہ:

"اگر کسی شخص کے مکان کے قریب ایک نہر بہتی ہو اور وہ اس میں روزانہ غسل پانچ وقت کرتا ہو تو کیا اس کے بدن پر میل باقی رہے گا"۔

یہ ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وعظ کے انداز میں نہیں بلکہ ایک لطیف استفسار کی صورت میں فرمایا۔ مخاطب بالکل خالی الذہن تھے کہ حضورؐ کیا فرمانا چاہتے ہیں اور آپؐ کے پیش نظر کیا ہدف ہے، جہاں تیر ہدایت جا کر بیٹھنے والا ہے۔

صحابہؓ نے سادگی اور بے تکلفی سے جواب دیا: اے اللہ کے رسولؐ جو شخص بہتی ہوئی نہر میں روزانہ پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو اس کے بدن پر میل کس طرح باقی رہ سکتا ہے۔ یہ بات بھی حق تھی جو شخص دن میں ایک مرتبہ بھی غسل کرتا ہو اس کا بدن بھی میل سے پاک رہتا ہے۔ پھر جو شخص پانچ مرتبہ غسل کرے تو اس کے بدن کی صفائی کا کوئی انکار کر سکتا ہے۔

یہ جواب سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاً فرمایا کہ یہی مثال اس شخص کی ہے جو دن میں پانچ مرتبہ نماز ادا کرتا ہے۔ اس کے ذمے بھی کوئی گناہ نہیں رہتا۔ غور فرمایئے کہ اس کے بعد نماز کی اہمیت سے کون غافل رہ سکتا تھا اور کیا وجہ تھی کہ صحابہؓ نماز کے لیے گھٹنوں کے بل بھی چل کر نہ آتے۔ ایک طرف صحابہؓ کے دل میں گناہ کی کراہیت موجود تھی اور اس سے پاک ہونے کی تڑپ۔ دوسری طرف صادق مصدوق کی یہ اطلاع کہ اس سے پاک ہونے کی ترکیب نماز پنج گانہ ہے۔ اندازہ کیجیے کہ یہ تمثیل کتنی کامیاب رہی ہو گی اور کیا یہ چند منٹوں کی تمثیل گھنٹوں کے وعظ پر بھاری نہ تھی؟

بے پتوں کی ٹہنی: ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دست مبارک میں ایک شاخ لی جس میں چند خشک پتے تھے۔ پھر اسے زور سے ہلایا' چونکہ پتے خشک تھے سب کے سب جھڑ گئے۔

صحابہؓ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ انھیں کچھ اندازہ نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرمانے والے ہیں۔ اتنے میں رسولؐ اللہ نے پوچھا: اس ٹہنی میں کوئی پتا باقی ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! یہ ٹہنی تو اب پتوں سے بالکل صاف ہے۔

یہ سن کر ارشاد ہوا کہ جس طرح ٹہنی کے پتے جھڑ گئے ہیں' اسی طرح حج کرنے سے تمام گناہ جھڑ جاتے ہیں۔ حج' اس کی مشکلات اور اس کے اثرات و نتائج کے اظہار کا یہ کتنا پاکیزہ اور موثر طریقہ تھا' اور دل و دماغ پر کس قدر گہرا نقش قائم کر گیا ہو گا۔

سدا بہار درخت: ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دوستوں سے فرمایا: ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے نہیں گرتے اور وہ مومن کی مثال ہے۔ بتاؤ وہ کون سا درخت ہے؟

یہ لطف استفسار اتنا اشتیاق انگیز تھا کہ تمام لوگ سوچ میں پڑ گئے اور جنگلی درختوں میں سے ایک ایک کی طرف ان کا خیال جانے لگا۔ لیکن وہ کسی ایسے درخت کا کھوج نہ لگا سکے جو مومن کی مثال ہو۔

بالآخر سب نے کہا: اللہ اور اس کا رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں۔ ارشاد ہوا: وہ درخت کھجور کا درخت ہے۔

اب صحابہؓ کی سمجھ میں آیا کہ مومن کی حقیقت کیا ہے۔ درختوں میں کھجور ہی کا ایک ایسا درخت ہے جس کی کوئی شے بے کار نہیں۔ انسان اس کا پھل مزے لے لے کر کھاتے ہیں' وہ غذا بھی ہے' دوا بھی ہے اور نہایت مقوی بھی۔ وہ ایک حلوہ بھی ہے جو تازہ بہ تازہ درخت سے اترتا ہے اور مہینوں تازہ ہی رہتا ہے۔ نہ اس کے ذائقے میں فرق واقع ہوتا ہے' نہ تاثیرات میں کمی آتی ہے۔ اس کی گٹھلی کا آٹا عرب میں کھایا جاتا ہے۔ اس کے پتوں سے گھروں کی بیسیوں ضرورت کی چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ اس کا تنا مکانوں میں شہتیر اور ستون بنتا ہے۔ کھجور کا درخت دیکھنے میں بھی شان دار اور پر عظمت ہوتا ہے۔ وہ صحرا میں اکیلا کھڑا ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سنتری ہے جو پہرہ دے رہا ہے' بلند و بالا اور تناور... یہی حال مومن کا ہے۔ مبارک' شان دار' اصلاح عالم کا باعث' نوع انسانی کے لیے اس کی ہر ادا کار آمد۔ وہ تنہا بھی ہو تو نمایاں اور باوقار ہوتا ہے۔

فیضان نبوتؐ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دین ہدایت لے کر آئے تو اس کا پیغام آپؐ نے گھر گھر اور کونے کونے پہنچا دیا۔ جس طرح ایک زور کی بارش آتی ہے تو دشت و دریا کو یکساں کر دیتی ہے' جل تھل ایک ہو جاتے ہیں لیکن پیغام رسانی اور ابلاغ حق کی اس یکساں نوعیت کے باوجود ہر شخص یکساں

فیض یاب نہیں ہوا۔ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ تفاوت کیوں ہے؟ کیا ابلاغ و رسالت میں امتیاز برتا گیا' یا پیغام ہدایت میں کوئی نقص تھا؟

اس اشکال کو رسولؐ اللہ نے ایک مثال کے ذریعے واضح کیا اور ارشاد فرمایا: اس ہدایت اور علم کی مثال جس کے ساتھ اللہ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے' ایک زور کے مینہ کی ہے جو روے زمین پر یکساں برسے۔

پھر ایک زمین وہ ہوتی ہے جو صاف اور نرم ہوتی ہے۔ وہ پانی کو پی لیتی ہے اور خوب گھاس' سبزہ اور چارہ اگاتی ہے۔ ایک زمین سخت ہوتی ہے مگر پانی کو روک لیتی ہے۔ پھر اللہ اس سے لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے۔ لوگ خود بھی پیتے ہیں' جانوروں کو بھی پلاتے ہیں' اور زراعت بھی کرتے ہیں' مگر ایک چٹیل میدان ہوتا ہے۔ وہ نہ پانی کو روکتا ہے اور نہ جذب کرتا ہے' نہ خود سیراب ہوتا ہے نہ دوسروں کو نفع دیتا ہے۔

بس پہلی اور دوسری مثال اس شخص کی ہے جو اللہ کے دین کو اچھی طرح سمجھ لے اور اس میں تفقہ پیدا کرے اور جس چیز کے ساتھ مجھے اللہ نے مبعوث فرمایا ہے اس کو خود سیکھے۔

تیسری مثال اس کی ہے جس نے ہدایت الٰہی کی طرف سر اٹھا کر نہ دیکھا اور جس چیز کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں' اسے قبول نہ کیا۔

دربار نبویؐ کے شعرا: سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور شعرا' حسانؓ بن ثابت' عبداللہؓ بن رواحہ' کعبؓ بن مالک ہیں۔ یہ حضرات مشرکوں کی ہجو کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر جو حملے کیے جاتے ان کا جواب بھی دیتے تھے۔

ایک دن حضرت عبداللہؓ بن رواحہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ذرا مناسب حال کوئی شعر سناؤ۔ وہ فوراً کھڑے ہوئے اور فی البدیہہ یہ اشعار سنائے:

(ترجمہ) میں نے آپؐ میں خوبی کو پہچان لیا اور تاڑ لیا۔ خدا آگاہ ہے کہ مری نگاہ نے دھوکا نہیں کھایا۔ آپؐ پیغمبر ہیں اور جو شخص آپؐ کی شفاعت سے قیامت کے دن محروم ہو گیا تو اس کو تقدیر نے ہلاک کر دیا۔ جب اللہ نے آپؐ کو خوبیوں کے ساتھ نوازا تو آپؐ کو مستحکم و استوار بھی بنائے۔ جس طرح کہ موسیٰؑ کو قوت پہنچائی' آپؐ کی ویسی ہی امداد کرے جیسا کہ ان کی امداد کی اور دوسروں کو دکھائے۔

تاثیر صحبت: بعض لوگ غرور ہدایت و تقویٰ میں اس قدر مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہمیں ماحول متاثر نہیں کر سکتا۔ ہم کسی شخص کی مجلس میں بیٹھیں' ہم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ اچھی بری صحبت کو یکساں سمجھتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو نیک صحبت کی اہمیت اور بری صحبت کی مضرت میں امتیاز

نہیں کرتے حالانکہ صحبت نیک و بد بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسلامی معاشرے کو پاکیزہ رکھنے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ ہر فرد ماحول کی تاثیرات سے آگاہ ہو۔ نیکیوں کی معیت کو پسند کرے اور بروں کی صحبت سے بچے۔

رسولؐ اللہ نے ایک تمثیل کے ذریعے اس حقیقت کو نہایت ہی موثر طور پر واضح فرمایا، ارشاد ہوا کہ:

"اچھے آدمی کے پاس بیٹھنے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص عطار کے پاس بیٹھ جائے۔ اگر اس سے عطر نہ لے تو کم از کم اس کا دماغ خوشبوؤں سے معطر تو ہو گا۔ اور برے آدمیوں کی صحبت کی مثال اس طرح ہے کہ کوئی شخص لوہار کی بھٹی کے پاس بیٹھ گیا۔ اگر اس کو زیادہ نقصان نہیں پہنچے گا تو کم از کم کپڑے تو سیاہ ہو جائیں گے اور بھٹی کی چنگاریاں اڑ اڑ کے اس کے کپڑوں میں سوراخ تو بنا دیں گی"۔

دیکھیے کتنی آسانی سے سمجھ میں آنے والی تمثیل ہے اور زندگی کے روز مرہ کے حقائق سے کتنی وابستہ۔ تاثیرات صحبت کے عمیق اور دراز فلسفوں کے مقابلے میں کتنی موثر۔ تمثیل کی خوبی یہ ہے کہ وہ استدلال کے اعتبار سے اتنی قوی ہمہ گیر اور عذرات کو زائل کرنے والی ہو کہ اس کے جواب میں کوئی بات نفس نہ پیش کر سکے۔

دو بھوکے بھیڑیے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین مخاطب بکریاں پالتے تھے۔ یہ ایک ایسی دولت تھی جو ان کی معاش کی بنیاد تھی۔ اس کا نقصان ان کے نزدیک نہایت خوفناک تھا۔ اور اس سے بچنے کا اہتمام ان میں نہایت شدید۔ وہ جانتے تھے کہ جب بھیڑیا بکریوں کے ریوڑ پر حملہ آور ہو جائے تو انجام کیا ہوتا ہے: معاشی تباہ حالی۔

دیکھیے اس نفسیاتی نکتے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح استعمال فرماتے ہیں۔

ایک روز اپنے دوستوں سے حضورؐ نے فرمایا: اگر دو بھوکے بھیڑیے بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیے جائیں تو بتاؤ، وہ بکریوں کا کیا حال کریں گے؟

صحابہؓ نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! وہ تمام بکریوں کو ہلاک کر ڈالیں گے اور ان کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ اس امر واقعہ کا اعتراف کرانے کے بعد لسان حکمت یکایک اصلاح نفوس کی طرف متوجہ ہوئی اور فرمایا: "جس طرح دو بھوکے بھیڑیے بکریوں کو تباہ کر ڈالتے ہیں اسی طرح حسد اور حرص انسان کی نیکیوں کو برباد کر دیتے ہیں"۔

اور بات دلوں میں تیر کی طرح ترازو ہو گئی۔ تمثیل کے حسن و جمال پر غور کیجیے۔ انسان کی نیکیوں کو بکریوں کے ریوڑ سے تشبیہ دی کہ نیکیاں انسان کے لیے اسی طرح سرمایہ فلاح و نجات ہیں جس طرح بکریوں کا ریوڑ عرب کے گلہ بانوں کے لیے سرمایہ فلاح و تمول تھا۔

حسد و حرص کو دو بھیڑیوں سے نہیں بلکہ دو بھوکے بھیڑیوں سے تشبیہ دی کہ حرص اور حسد دونوں

بھوک کی علامت ہیں۔ حریص کی آنکھ بھوکی ہوتی ہے جو کسی طرح سیر نہیں ہوتی اور حاسد بھی دوسروں کی خوبیوں کو دیکھ کر اسی طرح کڑھتا ہے جس طرح ایک بھوکا دوسروں کو انواع و اقسام کا مال کھاتے ہوئے دیکھ کر پیچ و تاب کھاتا ہے کہ یہ نعمت انھیں کیوں میسر ہو گئی۔ پھر ایک عام بھیڑیئے کا یہ طریقہ ہے کہ وہ بکریوں پر حملہ آور ہو تو ایک آدھ بکری کو اٹھا لے جانے کی کوشش کرے گا لیکن اگر وہ بھوکا ہے تو ایک بکری کو اٹھا لے جانے کے بجائے وہ ان کو پھاڑ پھاڑ کر ڈالتا جائے گا۔ جب دو بھوکے بھیڑیئے بکریوں کے ریوڑ میں گھس جائیں تو وہ ریوڑ کے ریوڑ میں تباہی مچا دیں گے۔

یہی حال حرص اور حسد کا ہے کہ جب کوئی شخص ان میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر اس کی نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں۔

لوہے کے دو جبے: اسلامی اخلاق میں بخل نہایت معیوب ہے اور سخاوت اور فیاضی نہایت محمود۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں میں دونوں کا وجود پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ بندگان خدا کی خدمت کے لیے دونوں ہاتھوں سے اپنا مال لٹاتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ ان کا جی چاہتا ہے کہ وہ بھی خدا کی راہ میں خرچ کریں مگر ان کے ہاتھ اس طرح بندھ کر رہ جاتے ہیں جیسے لوہے میں جکڑ دیے گئے ہوں۔ حالانکہ زندگی کی مشکلات میں سخی اور بخیل بالعموم یکساں مبتلا ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ سخی لازماً دولت مند ہو، اور بخل صرف وہ کرے جس کا ہاتھ تنگ ہو۔ بلکہ بخل اور سخاوت دو نفسیاتی کیفیتیں ہیں۔

اس حقیقت کو جس کی وضاحت میں ایک عالم نفسیات ایک کتاب لکھ کر بھی کامیاب نہ ہو گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مختصر سی تمثیل سے اس طرح بیان فرما دیتے ہیں کہ پوری حقیقت الم نشرح ہو جاتی ہے۔ فرمایا: بخیل اور صدقہ دینے والے کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جن کے جسم پر لوہے کے جبے ہوں، سینے سے گردن تک۔ سخی جب خرچ کرنا چاہتا ہے تو جبہ کشادہ ہو جاتا ہے یا اس کے جسم پر ڈھیلا ہو جاتا ہے اور بخیل جب خرچ کرنا چاہتا ہے تو اس کے جبے کا تمام حلقہ اپنی جگہ پر جم جاتا ہے۔ وہ اس کو کشادہ کرنا چاہتا ہے مگر وہ کشادہ نہیں ہوتا۔

کس قدر لطیف تمثیل ہے! معاشی مشکلات، سخی اور بخیل کو یکساں لاحق ہوتی ہیں۔ سخی کے لیے بھی دولت اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی بخیل کے لیے۔ لیکن اول الذکر کا دل ان مشکلات میں بھی کشادگی محسوس کرتا ہے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حوصلہ پا لیتا ہے۔ مگر جس کے دل کو بخل کا روگ لگا ہوا ہو، وہ خرچ کرنے کے لیے ہاتھ کھولنا چاہتا ہے مگر فقر کا اندیشہ اس کے ہاتھ لوہے میں جکڑ دیتا ہے۔ بہت سے دولت مند اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہوئے گھبراتے ہیں اور بہت سے کم آسودہ حال، جو کچھ پاتے ہیں، اپنے رب کی رضا میں خوشی سے خرچ کر دیتے ہیں۔

موثر تربیت کے جدید تقاضے

عبدالرشید صدیقیo

کوئی تنظیم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اس کے پاس وہ افرادی قوت نہ ہو جو اس کو حسن و خوبی سے چلا سکے۔ حتیٰ کہ ایک تجارتی ادارہ اور کمرشل کمپنی بھی اس بات کی محتاج ہے کہ اس کو چلانے کے لیے باصلاحیت افراد موجود ہوں۔ تحریک اسلامی جس کا مقصد معاشرے کی اصلاح اور اس میں تبدیلی اور انقلاب رونما کرنا ہے' بغیر باصلاحیت افراد کے کس طرح کامیاب ہو سکتی ہے!

تربیت کی اصل ذمہ داری فرد ہی کی ہے۔ اگر کوئی فرد اپنی تربیت نہ کرنا چاہے تو کوئی اور اس کے لیے یہ کام نہیں کر سکتا۔ تنظیم کا کام یہ ہے کہ وہ نظام کار مہیا کرے جس میں افراد اپنی مخصوص صلاحیتوں کو معلوم کر کے ان کو پروان چڑھائیں۔ انسان ہر طرح کی صلاحیتوں کے ہوتے ہیں اور ہر شخص اپنی جگہ منفرد ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ہر شخص کے ڈی این اے (DNA) کی ساخت اور انگلی کے نشانات تک مختلف ہوتے ہیں۔ یہ انفرادیت صرف جسمانی ساخت میں ہی نہیں ہوتی' بلکہ ہر شخص کی نفسیات' اس کا ذہن' اس کا مزاج' اس کا سوچنے کا انداز غرض یہ کہ ہر چیز مختلف ہوتی ہے۔ ہم ہر شخص کو ایک ہی سانچے میں نہیں ڈھال سکتے لیکن ہم ان کی تربیت اس طرح کر سکتے ہیں کہ ان کے انداز فکر اور ان کے طرز عمل کو ایک خاص حدود میں متعین کر دیں۔ مثلاً اگر ہم ان سے کہیں کہ ایک خاص مقام پر' ایک خاص وقت پر جمع ہو جائیں تو امید کی جا سکتی ہے کہ ان کی اکثریت جمع ہو جائے گی۔ اگر ہم ان سے مالی اعانت یا کوئی اور قربانی طلب کریں تو اکثریت یہ قربانی پیش کر سکے گی۔

ہمیں دیکھنا چاہیے کہ تنظیم کو کن صلاحیتوں اور قابلیتوں کے افراد کی ضرورت ہے۔ جب تک ان کو متعین نہ کیا جائے' تربیتی پروگرام تشکیل نہیں پا سکتے۔

---

o ریسرچ اسکالر' اسلامک فاؤنڈیشن' لسٹر' برطانیہ

۱- صالحیت

تحریک کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے ایسے افراد کی تلاش ہونی چاہیے جن کے اندر اصلاح کا جذبہ موجود ہو اور وہ اپنے ذاتی اور مالی وسائل کی قربانی کے لیے بھی آمادہ ہوں۔ ان کا تعلق معاشرے کے کسی بھی طبقے سے ہو، ان میں اگر قبول حق کی صلاحیت ہے تو ان کی تربیت کر کے انھیں تحریکی کاموں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ان کی ذہنی، علمی اور اخلاقی تربیت کے پروگرام بنائے جا سکتے ہیں تاکہ ان کی زندگی پاکیزہ ہو اور فکر صالح ہو۔ یہ لوگ تحریک کے لیے موثر سرمایہ بن سکتے ہیں۔ دین کی بنیاد پر کوئی تحریک اٹھانے کے لیے ایسے ہی پختہ اور صالح لوگ درکار ہیں۔ ان کی پشت پناہی سے تحریک فروغ پا سکتی ہے۔

۲- تنظیمی قابلیت (management skill)

انتظامی امور کی تربیت موجودہ دور کی بڑی اہم ضرورت ہے۔ وسائل کی عموماً قلت ہوتی ہے۔ اپنے اوقات کا صحیح استعمال، ذرائع و وسائل کا صحیح مصرف، نیز اپنے کاموں میں سلیقہ اور باقاعدگی پیدا کرنا، ہمارا ہدف ہونا چاہیے۔ یہ بہتر منصوبہ بندی، تقسیم کار، تفویض اختیارات اور وقت کی صحیح تنظیم کے طریقہ کار سے جو موجودہ دور کی تحقیقات اور تجربات سے منکشف ہوا ہے، ممکن ہے۔ اس پر کسی قدر تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔

(الف) **وقت کا صحیح استعمال:** ہم میں سے اکثر لوگ وقت کی قلت کی شکایت کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنے کاموں کا صحیح تجزیہ کریں تو پتا چلے گا کہ یہ محض ایک بہانہ ہے۔ ہم یا تو اسے غیر ضروری مصروفیتوں میں ضائع کرتے ہیں، یا اپنی نااہلیت پر پردہ ڈالنے اور بغیر سوچے سمجھے کام کرنے کے لیے یہ عذر تراشتے ہیں۔

وقت انسان کی سب سے زیادہ قیمتی متاع ہے۔ زندگی میں باقی تمام چیزیں ضائع ہونے کے بعد دوبارہ حاصل کی جا سکتی ہیں لیکن وقت گزرنے کے بعد واپس نہیں آ سکتا۔ وقت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اسے بروقت استعمال کرنا ہوتا ہے۔ اسے پس انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ ہر شخص کو دن رات میں ۲۴ گھنٹے دیے گئے ہیں۔ یہ مکمل مساوات کسی اور نعمت میں نہیں۔ اس لیے، جہاں آخرت میں دیگر نعمتوں کی جواب دہی کرنا ہے وہاں وقت کی جواب دہی سب سے زیادہ مشکل ہے۔ **سورۃ العصر** میں گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کھا کر ان تمام امور کی طرف حکیمانہ انداز میں رہنمائی کی گئی ہے۔

وقت کی صحیح تنظیم کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنا اور دوسروں کا وقت موثر انداز میں استعمال کریں۔ آپ ان تمام کاموں کا جائزہ لیں جن میں آپ کا وقت صرف ہوتا ہے۔ پھر آپ مناسب منصوبہ بندی سے اپنے کام کرنے کے انداز کو اس طرح موثر بنائیں کہ یہ کام بہ خوبی انجام پا سکیں۔ جب آپ جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ:

● اکثر فون اور ملاقاتیوں کا سلسلہ آپ کے کام میں خلل انداز ہوتا ہے۔ ● آپ کو بہت سے لگے

بندھے (routine) اور معمول کے کام کرنے ہوتے ہیں۔ ● آپ کام کی زیادتی سے زیر بار ہوتے ہیں۔ ● جب آپ تعطیل یا بیماری کے بعد واپس آتے ہیں تو کام کا ایک انبار جمع ہوتا ہے۔ ● آپ کا بہت سا وقت مسائل حل کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ ● کاغذی کارروائی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اس پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ ● بہت سا وقت میٹنگ میں صرف ہوتا ہے۔ ● بہت سا وقت غیر ضروری گفتگو کی نذر ہو جاتا ہے۔

اس طرح کے اور بہت سارے مسائل آپ کو درپیش آتے ہیں۔ ان کے حل کرنے کا ایک مفید طریقہ یہ ہے کہ آپ تمام ہی مسائل کی ایک مکمل فہرست مرتب کرلیں۔ ہر ایک کام پر آپ کتنا وقت صرف کرتے ہیں، اس کا اندازہ کرنے کے لیے آپ چند دن اپنے تمام کاموں کا اندراج ایک نقشہ اوقات کار (time sheet) میں کرلیں۔ پھر ان کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ کن مسائل میں آپ کا زیادہ وقت صرف ہوتا ہے اور کس طرح آپ اپنے کام کرنے کے انداز میں تبدیلی کر کے ان پر قابو پا سکتے ہیں۔ برسوں کی غلط عادتوں کو یکسر بدلنا مشکل ہو گا لیکن اگر تندہی سے کوشش کی جائے تو ان کو ضرور بدلا جا سکتا ہے۔ اسی طرح آپ اپنا کام دوسروں کو تفویض بھی کر سکتے ہیں۔

یہ تمام مسائل جو بیان ہوئے ہیں ان کو حل کرنے کے لیے چند مفید مشورے دیے جا رہے ہیں۔ ان پر کاربند ہو کر بڑی حد تک انھیں حل کیا جا سکتا ہے۔

(ب) وقت کی منصوبہ بندی: آپ کہیں گے کہ اصولاً یہ صحیح ہے لیکن ہمارے پاس اس کے لیے وقت ہی کہاں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بغیر منصوبہ بندی کے آپ کے پاس کسی کام کے لیے بھی وقت نہ ہو گا۔ ابتدا میں اس کے لیے آپ کو کچھ وقت صرف کرنا ہو گا لیکن یہ مثبت سرمایہ کاری ہے۔ چونکہ اس قیمتی نعمت کا ایک محدود سرمایہ ہمارے پاس ہے، اس لیے اپنے اوقات کی صحیح طور پر منصوبہ بندی کرنے کی عادت ڈالنا ضروری ہے۔ ہمارے لیے تو یہ آسان ہونا چاہیے کیونکہ نمازوں کے اوقات ہمارے کام کے اوقات کو متعین کر دیتے ہیں۔

آپ اپنے کاموں کی ایک فہرست بنائیں۔ ان میں سے بعض "قلیل المیعاد" کام ہوں گے اور بعض "طویل المیعاد"۔ آپ ان کی ترجیحات مقرر کریں۔ "طویل المیعاد" منصوبے کو بھی قابل عمل حد تک اہداف میں منقسم کر لیا جائے تو اس سے پست ہمتی نہیں پیدا ہوتی۔ ہر ایک ہدف کو حاصل کرنے کے لیے کئی راستے ممکن ہو سکتے ہیں جن کو حالات کی مناسبت سے طے کرنا چاہیے۔ یہ فیصلے ہمیں ہر قدم پر کرنے ہوتے ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ جو کچھ ہمیں حاصل کرنا ہے یا جو ہمارا مقصد ہے، اس کو تحریر میں منضبط کرلیں تاکہ ہماری منزل ہمیشہ پیش نظر رہے اور ہم راہ کے کانٹوں میں الجھ کر نہ رہ جائیں۔

ہمارے کام دو نوعیتوں کے ہوتے ہیں۔ بعض "اثباتی عمل" (active) اور اقدام چاہتے ہیں اور بعض "جوابی عمل" (reactive) یا ردعمل چاہتے ہیں۔ اصلاً کام "اثباتی عمل" ہی ہے جس سے آپ اپنے مقاصد کو حاصل کر سکتے ہیں۔ "جوابی عمل" میں وہ کام شامل ہیں جو ہر روز آپ کی میز پر غیر ضروری خطوط کی صورت میں آتے ہیں۔ وہ لوگ جو صحیح منصوبہ بندی سے کام نہیں کرتے' اس کو اصل کام سمجھ کر اپنا وقت اسی میں صرف کرتے ہیں۔ اس لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ آپ اپنی فہرست سے بے دردی کے ساتھ ان تمام امور کو خارج کر دیں جو آپ کے مقصد کے حصول کے لیے غیر ضروری ہیں۔ اس طرح آپ "اثباتی کاموں" کے لیے زیادہ اور مناسب وقت دے سکیں گے اور اس کے بعد "جوابی عمل" قسم کے امور پر مناسب وقت صرف کر سکیں گے۔

وقت کی تنظیم کے لیے ڈائری ایک بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں آپ رپورٹ لکھیں' ملاقاتوں اور میٹنگ کے اوقات درج کریں تاکہ ہر روز آپ کو اپنی مصروفیات کا علم ہو۔ ڈائری کے علاوہ' بصری اوقات نامہ (visual planner) کے ذریعے آپ ماہ بہ ماہ پورے سال کا خاکہ بہ یک وقت ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھ سکتے ہیں۔ اپنے اوقات کی منصوبہ بندی کا ہمیشہ جائزہ لیتے رہیے۔ ترجیحات بدل سکتی ہیں۔ کچھ اور مسائل درپیش آسکتے ہیں۔ ان کے پیش نظر اپنے اوقات کار میں تبدیلی کرنا لازمی ہے۔

(ج) **کاغذی کارروائی :** ہمارا اکثر وقت رپورٹیں یا ضخیم کتابیں پڑھنے میں صرف ہوتا ہے۔ آپ اپنے مطالعے کی رفتار تیز کریں تاکہ کم وقت میں زیادہ چیزوں کا مطالعہ کیا جا سکے۔ یہ ایک ہنر ہے جو چند ہفتوں کی مشق سے حاصل ہو سکتا ہے۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر چیز کا پوری طرح مطالعہ کیا جائے۔ بعض کتابوں کے دیباچے اور چند صفحوں کی ورق گردانی سے آپ کو معلوم ہو سکتا ہے کہ پوری کتاب کا مطالعہ مفید رہے گا یا نہیں۔

جو خطوط یا سرکلر آئیں ان کو پڑھ کر تین گروپوں میں تقسیم کریں:

- جن پر فوری کارروائی کرنا ہے۔ (out tray)
- جن پر کارروائی شروع کی جا سکتی ہے لیکن مکمل نہیں ہو سکتی۔ (pending tray)
- جن پر دوسروں سے مشورہ کرنے کے بعد کارروائی کرنا ہے۔

ڈاک میں بہت سی غیر ضروری چیزیں آتی ہیں' ان کو ضرور پھینک دیں۔ اس طرح آپ اپنا وقت ضروری کاموں میں صرف کر سکیں گے۔ غیر ضروری امور خود بخود میعاد گزرنے کے بعد ختم ہو جائیں گے۔

(د) **میٹنگ :** میٹنگ اور اجتماعات میں بہت وقت صرف ہوتا ہے۔ لیکن اگر ان کی منصوبہ بندی ٹھیک ہو اور ان کو صحیح طریقے سے چلایا جائے تو کم وقت میں کافی کام انجام پا سکتا ہے۔ اگر شرکا درج ذیل باتوں کا

اہتمام کریں تو وقت بچایا جا سکتا ہے:

- جن امور پر گفتگو کرنا ہے ان کے بارے میں پہلے سے غور کر کے آئیں۔
- بروقت آئیں اور اپنے ساتھ تمام ضروری کاغذات لائیں۔
- اپنی بات کو مناسب انداز میں بیان کریں۔ غیر ضروری طوالت سے بچیں۔
- باوقار انداز اور اطمینان سے توجہ کے ساتھ کارروائی میں حصہ لیں۔
- جو فیصلے ہو جائیں ان کو خوش دلی سے قبول کرلیں۔

(ہ) **ٹیلی فون**: ٹیلی فون ایک اہم ضرورت ہے۔ اگر اس کا صحیح استعمال نہ ہو تو اس سے بے حد وقت ضائع ہوتا ہے۔ درج ذیل اصولوں کو ملحوظ رکھیں:

- پہلے ہی ذہن بنا لیں کہ کس سے کیا بات کرنی ہے اور عدم موجودگی میں کس سے گفتگو کرنی ہے۔ اگر کہیں پیغام ریکارڈ کرنے کے لیے ٹیپ لگی ہو تو کیا پیغام ریکارڈ کرانا ہے۔
- بہتر ہے کہ فون کرنے سے پہلے تحریر کرلیں کہ کن امور پر بات کرنی ہے۔
- فون اٹھانے پر اپنا نام اور فون کرنے کا مقصد بتائیں۔
- اگر کسی اور کے لیے فون آئے اور وہ موجود نہ ہو تو پیغام نوٹ کر کے اس کے لیے چھوڑ دیں۔
- کام میں مشغول ہیں اور فون کا جواب دینا نہیں چاہتے تو ریکارڈ کے لیے ٹیپ استعمال کر سکتے ہیں۔

(ر) **دوسروں کے اوقات ضائع کرنا**: ہم میں سے اکثر لوگ دوسروں کا وقت ضائع کرنے کے گناہ گار ہیں۔ اس کی کئی مثالیں ہیں:

● لوگوں کو بلاوجہ منتظر رکھنا۔ وقت پر آنے کے بجائے تاخیر سے آنا۔ وقت پر جواب دینے کے بجائے تاخیر سے جواب دینا، یا بالکل ہی جواب نہ دینا۔ ● بلاوجہ غیر حاضر ہونا۔ ● ان معاملات میں مداخلت کرنا جن سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔ ● دوسروں کی بات کو پوری طرح نہ سننا یا بات کو غلط سمجھنا۔ ● اہم امور کو بھول جانا۔ ● اپنے مسائل خواہ مخواہ دوسروں کے آگے پیش کرنا اور اصرار کرنا کہ ان کو حل کیا جائے۔

اپنا اور دوسروں کا وقت بچانے کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ جامع اور معنی خیز حدیث ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے: "کسی کے مسلمان ہونے کی خوبی یہ ہے کہ اس بات کو ترک کر دے جو اس سے متعلق نہ ہو"۔

(ز) **اختیارات کی تفویض**: اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ تمام کام جو آپ کو ناپسند ہوں یا جن

سے آپ بوریت محسوس کرتے ہوں، دوسروں کے سر تھوپ دیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ آپ اپنی ذمہ داری کا کچھ حصہ اپنے رفقا کے سپرد کر دیں۔ ان کو یہ اختیار دیں کہ آپ سے مشورہ کیے بغیر وہ خود فیصلے کریں۔ تاہم آپ تمام کاموں کی جواب دہی کے ذمہ دار رہیں گے۔ اختیارات تفویض کرنے کے لیے آپ کو محتاط طریقے پر یہ جائزہ لینا ہو گا کہ کون سے امور اصولی طور پر کسی اور کے سپرد کیے جا سکتے ہیں۔

اختیارات کی تفویض کے کئی فوائد ہیں:

- آپ کا وقت دوسرے اہم کاموں میں صرف ہو سکے گا۔
- دوسروں کو کام کرنے کا تجربہ ہو گا۔
- دوسروں کی ہمت افزائی ہو گی اور ان میں کام کرنے کا اعتماد پیدا ہو گا۔
- جن لوگوں کو کام کرنا ہے اگر وہ خود اس کے ذمہ دار ہوں گے تو کام بہتر طریقے سے ہو گا۔

اس سے پہلے کہ آپ اختیارات تفویض کریں، آپ کو اس کام کا ہنر آنا چاہیے اور اس کا تجربہ کرنا چاہیے۔ کافی تجربات کے بعد یہ کام آپ آسانی سے کر سکیں گے۔ اس سلسلے میں درج ذیل امور ملحوظ رکھیں:

۱۔ مناسب اور اہل رفقائے کار کا انتخاب اور تقرر ضروری ہے۔ اگر کام ٹھیک نہ ہو تو اپنے اسٹاف کو مورد الزام نہ ٹھہرائیں کیونکہ ان کا تقرر آپ نے کیا تھا۔ صحیح لوگوں کے تقرر کے بعد ہی اختیارات تفویض کیے جا سکتے ہیں۔

۲۔ جن افراد کو اختیارات تفویض کرنے ہیں، ان کی تربیت بھی ضروری ہے۔ پہلے ان کے ساتھ مل کر کام کیا جائے۔ ان کو کام سپرد کرنے کے بعد نگرانی کی جائے۔ اختیارات تفویض کرنے کے بعد ان سے رپورٹ لی جائے۔ مناسب مشورے دیے جائیں۔ معمولی کاموں سے ابتدا کی جائے اور آہستہ آہستہ مشکل کام سپرد کیے جائیں تاکہ ان کو اعتماد حاصل ہو۔

۳۔ تربیت کے مرحلے میں اور اس کے بعد بھی آپس میں مسلسل ربط رہنا چاہیے۔ جو اختیارات تفویض کیے ہیں ان کو اچھی طرح منضبط کیا جائے اور ذہن نشین کر لیا جائے۔

۴۔ ایک مرتبہ اختیارات تفویض کرنے کے بعد کام میں دخل اندازی سے پرہیز کیا جائے۔ فوراً اپنے ماتحت کے احکام کو کالعدم نہ کریں۔ اگر وہ آپ کے پاس آئے تب بھی یہ مشورہ دیں کہ وہ خود سوچے اور مسائل کا حل تلاش کرے۔ اس طرح اس میں مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گی۔

۵۔ اختیارات کی تفویض کا مطلب ذمہ داری سے دست برداری نہیں۔ مقررہ وقفے سے کام کا جائزہ اور ترقی کی رفتار کا اندازہ کرنا ضروری ہے۔ تفویض اختیارات کی خوبی کنٹرول کو برقرار رکھنا ہے۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے: آپ کو حقیقی اختیار اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب آپ یہ دوسروں کو تفویض کرنا شروع کر دیں۔

۳- صلاحیت ابلاغ (communication skills)

اپنی بات موثر انداز میں دوسروں تک پہنچانا اور اس کے لیے ذرائع کا صحیح استعمال اور اس میں مہارت پیدا کرنا، دور حاضر کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اس کے ذریعے دعوت کو موثر انداز میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ تقریری اور تحریری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں کافی کچھ لکھا جا چکا ہے۔ آج کل اظہار مدعا (presentation skill) کے لیے overhead projector، چارٹ، نقشے، کمپیوٹر اور گرافکس کا استعمال عام ہو رہا ہے۔ موثر ابلاغ کے لیے ان کا مناسب استعمال بہت مفید ہے۔

(الف) ویڈیو: ویڈیو پر ایسے اسباق مرتب کیے جا سکتے ہیں جن سے کارکنوں کو دعوتی کام کرنے کی عملی تربیت دی جا سکتی ہے۔ اس میں ایک شخص داعی کا کردار ادا کرتا ہے اور مختلف مکاتب فکر اور استعداد کے لوگوں کے سامنے دعوت پیش کرتا ہے۔ یہ سارا پروگرام ریکارڈ کر لیا جاتا ہے اور دوبارہ دکھا کر شرکا اپنی خامیاں خود دیکھ سکتے ہیں اور ان کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ نیز اس میں جو خوبیاں ہوں، ان کو دوسرے لوگ اپنے دعوتی کام میں استعمال کر سکتے ہیں۔

(ب) کمپیوٹر: ۱۴۵۰ میں چھاپہ خانے کی ایجاد نے ایک علمی انقلاب برپا کر دیا۔ علم، کلیسا کے محدود طبقے سے نکل کر عوام الناس تک پھیل گیا اور ناخواندگی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن گئی۔ کمپیوٹر اس دور کی انقلاب آفریں ایجاد ہے جس نے بے شمار سہولتوں کے علاوہ، ترقی کی رفتار میں حیرت انگیز اضافہ کر دیا ہے۔ کمپیوٹر ایک نیا کلچر، نئی زبان اور نئے طرز تخاطب کو فروغ دے رہا ہے۔ تحریک کے لیے اس نئی ٹکنالوجی میں مہارت ہی نہیں بلکہ فوقیت حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ خلیجی جنگ میں الیکٹرانک ٹکنالوجی کے استعمال نے اس کی اہمیت اور بھی بڑھا دی ہے۔

اب ایک کمپیوٹر دفتر کے سارے نظام چلانے کے قابل ہے۔ تمام معلومات اور حسابات کو چند منٹ میں یک جا کرنا، گرافکس کی مدد سے نقشے اور چارٹ بنانا معمولی بات ہے۔ سی ڈی روم کی چند سینٹی میٹر ڈسک میں تمام پتے، فون نمبر اور مصروفیات کے ریکارڈ کے علاوہ ضخیم لائبریریوں کو بھی محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ multi media ہونے کی وجہ سے کمپوزنگ کے علاوہ اس میں تصاویر اور آواز بھی شامل ہے۔ اس سے گفتگو بھی کی جا سکتی ہے اور یہ مسائل کا حل بھی پیش کر سکتا ہے۔ اب کمپیوٹر بھاری بھرکم مشین نہیں بلکہ محض ہتھیلی پر رکھ کر بھی چلایا جا سکتا ہے۔

(ج) انٹرنیٹ: انٹرنیٹ سے گزشتہ ۸ سال سے ذرائع ابلاغ میں حیرت انگیز انقلاب آگیا ہے۔ اس کے لیے ایک کمپیوٹر، ایک موڈیم (modem) اور ٹیلی فون لائن درکار ہے۔ فون کال کی قیمت مقامی فون کال کے برابر ہوتی ہے۔ آپ اپنا پیغام چند سیکنڈ میں ارسال کر سکتے ہیں۔ اس طرح محض ایک بٹن دبا کر بلامشقت اور خرچ، دنیا بھر میں بات پہنچائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اب فون اور فیکس کے بجائے نیا ذریعہ مراسلت

انٹرنیٹ ہو رہا ہے۔ ۵۰ ملین سے زائد لوگ اس سے وابستہ ہیں۔ اس کے ذریعے دنیا کے تمام بڑے لیڈروں، حکومتوں، بین الاقوامی اداروں اور کمپنیوں سے خط و کتابت ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کسی بھی دل پسند موضوع پر اپنے ہم خیال یا ہم پیشہ لوگوں سے باہمی رابطہ اور کانفرنس کر سکتے ہیں۔ بین الاقوامی رابطے کے علاوہ اس کا استعمال روز مرہ کی خطوط نویسی اور خبر رسانی اندرون ملک اور خود ایک ادارے میں ہو سکتی ہے، جسے (intranet) کہتے ہیں۔ اگر تحریک کی تمام ہی شاخوں میں ای۔میل کی سہولت ہو تو سرکلر یا خطوط ڈاک خرچ بچا کر بہ یک وقت سب کو بھیجے جا سکتے ہیں۔

انٹرنیٹ کے ذریعے ایک اسکالر دنیا بھر کی لائبریریوں سے رابطہ کر سکتا ہے۔ ہر قسم کی معلومات اور مطلوبہ حوالہ جات گھر بیٹھے حاصل کر سکتا ہے۔ اکثر اخبارات اور جرائد بلاقیمت دیکھے جا سکتے ہیں۔ بہت ساری معلومات اپنی ڈسک (disk) پر اتار (down load) سکتے ہیں، کیونکہ یہ مفت اور بلاضابطہ ہے اس لیے فحاشی کی اشاعت کا ذریعہ بھی بن گیا ہے۔ چور، بنک اور دیگر کمپنیوں سے رقم چرا سکتے ہیں اور خفیہ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ غرض کہ ہر قسم کے جرائم کا ارتکاب کیا جا سکتا ہے جیسا کہ مولانا رومؒ نے اپنی مثنوی میں فرمایا ہے۔

علم را برتن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

(ترجمہ: اگر علم کا حصول اپنی نفسانی خواہشات کے لیے ہو گا تو وہ اژدھے کی طرح خطرناک ہے۔ اگر علم کا حصول اصلاح نفس کے لیے ہے تو وہ ایک مشفق دوست ہے)۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا منقول ہے:

اَللّٰھُمَّ انْفَعْنِی بِمَا عَلَّمْتَنِی وَعَلِّمْنِی مَا یَنْفَعُنِی وَارْزُقْنِی عِلْمًا یَّنْفَعُنِی (حاکم)

الٰہی! جو علم تو نے مجھے دیا ہے میرے حق میں اسے نافع کر اور جو علم نافع ہو وہ مجھے عطا کر اور وہی علم میرے نصیب فرما جو مجھے نفع دے۔

۴۔ قائدانہ صلاحیت

تحریک کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اسے ایسے قائد میسر آئیں جو علم اور تقویٰ کے ساتھ ساتھ فرض شناس، مثالی عمل کے حامل، باہمت اور یقین محکم سے معمور ہوں اور مستقل مزاجی سے تحریک کی قیادت کر سکیں۔ ان کے اوصاف حمیدہ میں صبر، تحمل، تدبر، بصیرت، خود اعتمادی اور روحانیت نمایاں ہو۔ جس کے ذریعے وہ لوگوں میں جذبہ عمل اور قربانی کے لیے آمادگی پیدا کر سکیں۔

دین کی خدمت اور انسانیت کو صحیح راستے پر لانے کے لیے قائدانہ صلاحیت پیدا کرنے کی خواہش، کوئی مذموم جذبہ نہیں ہے۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ "بڑائی" کی ہوس اور اقتدار کے لیے تگ و دو ایک غلط

بات ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا (القصص ۲۸: ۸۳) وہ آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں اپنی "بڑائی" نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں------ لیکن یہ تمنا کہ انسان لوگوں کو راہ حق پر چلانے میں پیش پیش رہے، ایک قابل قدر جذبہ ہے۔ اس بات کی دعا اللہ کے نیک بندے یوں کرتے ہیں: وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ○ (الفرقان ۲۵: ۷۴) اور ہم کو پرہیز گاروں کا امام بنا۔

اس آیت کی تفسیر مولانا مودودیؒ تفہیم القرآن میں یوں فرماتے ہیں:

یعنی ہم تقویٰ اور اطاعت میں سب سے بڑھ جائیں۔ بھلائی اور نیکی میں سب سے آگے نکل جائیں۔ محض نیک نہ ہوں بلکہ نیکوں کے پیشوا ہوں اور ہماری بدولت دنیا بھر میں نیکی پھیلے۔

یہی بات حضرت یوسف علیہ السلام کے ملک مصر میں قیادت حاصل کرنے میں مضمر ہے۔

(الف) ندرت فکر و عمل: قائدانہ صلاحیتوں میں اہم صلاحیتیں غور و فکر، اختراعی قوت، قوت ارتکاز اور حسن تدبیر ہیں۔ ہمارے ذہن کو اللہ تعالیٰ نے بڑی صلاحیتیں دی ہیں لیکن ہم اس کا صحیح استعمال نہیں کرتے۔ ہماری فکر میں جدت اور ندرت ہونی چاہیے۔ محض اندھی تقلید سے معاشرے میں کوئی انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔ امت مسلمہ کے مسائل اور تحریک کے داخلی مسائل تقاضا کر رہے ہیں کہ ان پر غور و فکر کیا جائے اور حسن تدبر سے ان کے حل پیش کیے جائیں۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

ندرت فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوق انقلاب ندرت فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب
ندرت فکر و عمل سے معجزات زندگی ندرت فکر و عمل سے سنگ خارہ لعل ناب

(بال جبریل، ص ۱۵۰ - ۱۵۱)

ندرت فکر و عمل سے مراد وہ قوت اختراع (initiative) اور تخلیقی قوت (creativity) ہے جس کے بغیر مسائل کو حل نہیں کیا جا سکتا۔ ہم غلطی کے خوف سے انقلابی اقدام اٹھانے سے گریز کرتے ہیں اور نئی راہیں تلاش کرنے سے گریزاں رہتے ہیں لیکن شاعر مشرق کا واضح پیغام ہے ؎

تراش از تیشہ خود جادۂ خویش براہ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دست تو کار نادر آید گنا ہے ہم اگر باشد ثواب است

(پیام مشرق، ص ۵۹)

(ترجمہ: اپنے تیشے سے خود اپنا راستہ بنا۔ دوسروں کی راہ پر چلنا عذاب ہے۔ اگر تجھ سے کوئی اچھوتا کام ہو جائے تو بھی وہ قابل ثواب ہے اگرچہ گناہ ہی کیوں نہ ہو)۔

یہ اس حدیث کی تشریح ہے کہ مجتہد کو غلطی پر بھی ثواب ملتا ہے۔ ہمارے سامنے انبیا علیہم السلام کی قابل قدر مثالیں موجود ہیں۔ قرآن میں ان کے طریقہ دعوت و تبلیغ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ دیکھیے

کہ انھوں نے کس طرح اپنے حالات کے مطابق دعوت پیش کرنے کی راہیں اختیار کی ہیں۔ ہم کو بھی اپنے اندر اس بات کی اہلیت پیدا کرنی چاہیے کہ جو مسئلہ درپیش ہو' اس میں غوروفکر کو اس طرح مرکوز کر سکیں کہ باآسانی تہہ تک پہنچ جائیں۔ یہی نہیں بلکہ اپنی فراست اور تجربے سے اس کا کوئی معقول حل بھی ڈھونڈ نکالیں۔ دین میں ذکر و فکر اور عبادات کی اہمیت اسی لیے ہے کہ ان کے ذریعے خیالات کو ایک نقطے پر مرکوز کیا جاتا ہے۔ قوت ارتکاز سے منصوبہ بندی میں بڑی مدد ملتی ہے۔ گہری سوچ اور عمیق مطالعے کے بعد جو منصوبہ بنتا ہے' اس کو عملی جامہ پہنانے میں آسانی ہوتی ہے کیونکہ پیش آنے والے مسائل کا پہلے ہی سے اندازہ کرلیا جاتا ہے۔ ایک چھوٹی سی مشین کو چلانے کے لیے ماہر کاریگر' تیل اور کل پرزوں کی فراہمی' خام مال کا بندوبست اور مرمت کی بروقت سہولت مہیا نہ ہو تو کارخانہ خسارے میں پڑ جاتا ہے۔ دعوت دین تو بڑا سنگلاخ میدان ہے۔ اس میں ذرا سی غفلت اور بھول چوک سے تحریک کو زبردست نقصان پہنچ سکتا ہے۔

(ب) **منصوبہ بندی:** تحریک کی قیادت کرنے کے لیے منصوبہ بندی کی صلاحیت اور اس کی اہمیت مسلم ہے۔ قائد کے سامنے ایک واضح نصب العین ہونا چاہیے اور اس کے حصول کے لیے منزل کی راہوں کا تعین ہونا ضروری ہے۔ منزل مقصود کی نشان دہی کے بعد اس کی بنیاد پر ترجیحات قائم کرنا اور پھر لائحہ عمل مرتب کر کے ہی مقاصد کے حصول کی جانب پیش قدمی ہو سکتی ہے۔

(ج) **اعتماد' وجدان اور قوت محرکہ:** قائد کو اپنے رفقا کو ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کو اس کی قیادت پر مکمل اعتماد ہو اور وہ حصول منزل کی راہ میں اپنا سب کچھ لگا دینے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب قائد کی طرف سے یہ بات ان کے وجدان کا حصہ بن جائے۔ جب وہ یہ محسوس کریں کہ ان کی قربانی لائق تحسین ہے' ان کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو صحیح طور سے استعمال کیا جا رہا ہے' اور ان کو اپنی تربیت کے مواقع حاصل ہیں۔ انھیں احساس ہو کہ معاملات میں ان کے مشورے اور فیصلوں میں ان کی شرکت قبول کی جا رہی ہے۔

جامع تربیتی پروگرام ان گزارشات سے اندازہ ہوا ہو گا کہ ہم اپنے تربیتی پروگرام ایک روایتی انداز میں چلا کر وہ افراد تیار نہیں کر سکتے جو تحریک کی کامیابی کے لیے مطلوب ہیں۔ اگر ہماری تربیت گاہوں کے پروگرام ان تمام ضروریات کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیے جائیں جن میں کارکنوں کے تزکیہ نفس کی بالیدگی' اخوت اور باہمی رفاقت کے مناسب مواقع ہوں' علمی اور عملی صلاحیتوں کے نشوونما کا موثر انتظام ہو' تو امید کی جا سکتی ہے کہ ان مقاصد کے حصول میں کامیابی ہو گی' جن کی نشان دہی کی گئی ہے (مصنف کے اسی سلسلے کے دو مضامین "تربیت و تزکیہ: اہمیت و شرائط" (اگست ۹۸)' اور "تربیت و تزکیہ: تربیت کا عمل اور طریقہ کار" (ستمبر ۹۸) میں شائع ہو چکے ہیں)۔

سود کے جواز کے لیے حیلے

ایک جائزہ

مولانا گوہر رحمٰن ٥

انسان جب کسی چیز کا عادی ہو جاتا ہے تو اسے چھوڑنا اس کے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے۔ یہی حال سود کا ہے۔ لوگ سودی کاروبار کے عادی بن چکے ہیں' اور اس میں مہارت اور تجربہ حاصل کر چکے ہیں' اس لیے حیلوں بہانوں سے اپنے اس دھندے کو جاری رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قسم قسم کے سودی حیلے تلاش کرتے رہتے ہیں تاکہ نام تجارت کا ہو اور کام سود کا' بورڈ حلال کھانے کا ہو اور ملتا ہو حرام۔ ہر دور کے سود خوروں نے "حیل ربویہ" کے ذریعے اپنا سودی کاروبار چلایا ہے لیکن جدید دور کی سودی معیشت کے ماہرین نے نئے نئے سودی حیلے ایجاد کیے ہیں جن کی حقیقت سے پردہ اٹھانا ضروری ہے۔

حیلے کی حقیقت

حیلے کی حقیقت کیا ہے؟ کیا حیلے کی وجہ سے حرام حلال ہو سکتا ہے' ظلم انصاف بن سکتا ہے اور ناپاک پاک ہو سکتا ہے؟ رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے: "تم وہ جرم نہ کرو جو یہودیوں نے کیا تھا کہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حیلوں کے ذریعے حلال سمجھ لو" (فتاویٰ کبریٰ لابن تیمیہ' ج ۳' ص ۱۲۳' طبع ۱۳۸۵ھ وقال اسنادہ جید)۔ لفظ حیلہ اپنے اصل لغوی مفہوم کے اعتبار سے کوئی بری چیز نہیں ہے۔ امام راغب اصفہانیؒ (م ۵۰۲ھ) نے لکھا ہے: "کسی حالت اور مقصد تک پہنچنے کی خفیہ تدبیر کو حیلہ کہا جاتا ہے۔ اس کا اکثر استعمال تو برے کام کے لیے ہوتا ہے مگر یہ اس کام کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جس میں حکمت اور مصلحت ہو" (المفردات فی غریب القرآن ' ص ۱۳۷' طبع ۱۹۶۱)۔ قرآن میں مستضعفین کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَۃً وَّلَا یَھْتَدُوْنَ سَبِیْلًا ٥ (النساء ۴:۹۸) جو کسی خفیہ تدبیر کی طاقت نہیں

---

٥ شیخ القرآن والحدیث ' الجامعہ الاسلامیہ تفہیم القرآن' مردان

رکھتے اور نہ ان کو کسی پناہ گاہ تک پہنچنے کا راستہ معلوم ہے---- اس آیت میں ہجرت کی تدبیر کے لیے حیلے کا لفظ استعمال ہوا ہے جو ظاہر ہے کہ نیکی کا کام ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں: "حیلہ کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے خفیہ راستے کا نام ہے"۔ اس تعریف سے معلوم ہوا کہ اچھے مقصد کے لیے حیلہ کرنا اچھا ہے اور برے مقصد کے لیے حیلہ کرنا برا ہے۔ علامہ بدر الدین عینیؒ نے نسفی کی کتاب **الکافی** کے حوالے سے امام محمدؒ کا قول نقل کیا ہے: "یہ مسلمانوں کے اخلاق میں شامل نہیں ہے کہ وہ حق کے ابطال کے لیے حیلے کریں اور اللہ کے احکام سے فرار اختیار کریں" (**عمدۃ القاری شرح بخاری' کتاب الحیل**)۔

امام محمدؒ کے شاگرد ابو حفص کبیر نے اپنے شیخ کا قول اس طرح نقل کیا ہے: "جس حیلے کے ذریعے حق کا ابطال یا باطل کا احقاق کیا گیا ہو' وہ مکروہ ہے اور مکروہ ان کے نزدیک حرام کے قریب تر ہوتا ہے" (**فتح الباری** '**کتاب الحیل**)۔ امام محمدؒ کے دوسرے شاگرد ابو سلیمان جوزجانی نے ان کا یہ قول بھی نقل کیا ہے: "**کتاب الحیل** ہماری کتابوں میں سرے سے شامل ہی نہیں ہے" (**اعلاء السنن** ج ۱۸' ص ۴۳۲)۔

اس مختصر سی بحث سے ثابت ہوا کہ حیلوں سے حرام' حلال نہیں ہو سکتا اور اس قسم کے حیلے کرنا اسلامی اخلاق کا تقاضا نہیں ہے۔

شریعت کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ جائز اور مباح کام اگر حرام کا ذریعہ بنتا ہو اور حرام کا راستہ کھولتا ہو تو وہ ممنوع اور ناجائز ہوتا ہے۔ اس کو قاعدہ **سدا الذریعہ** کہا جاتا ہے۔ حیل ربویہ اور سودی حیلے چونکہ سود کا راستہ کھولنے کا ذریعہ بنتے ہیں اس لیے ان کا سدباب ضروری ہے۔

سود کے جواز کے لیے جو حیلے پیش کیے جا رہے ہیں ہم ان کا ایک جائزہ پیش کرتے ہیں۔

۱- سونے کی قیمت کو معیار بنانا

بعض لوگوں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ کرنسی نوٹوں کے قرض لین دین میں سونے کی قیمت کو معیار بنایا جائے۔ یعنی قرض دیے گئے نوٹوں کے بدلے میں سونے کی جتنی مقدار ملتی ہو واپسی کے وقت نوٹوں کی مقدار سونے کی اسی مقدار کی قیمت کے برابر ہونی چاہیے۔ مثلاً آج کسی کو پانچ ہزار روپے قرض دیے گئے جس کے بدلے میں ایک تولہ سونا ملتا ہے لیکن ادائیگی کے وقت ایک تولے کی قیمت چھ ہزار ہو گئی تو چھ ہزار روپے دینے ہوں گے۔ [وہ کہتے ہیں کہ] یہ ربا اس لیے نہیں ہو گا کہ ایک تولے کی قیمت کے برابر نوٹ لیے تھے اور ایک تولے ہی کی قیمت کے برابر نوٹ واپس کیے گئے ہیں۔ یہ ہے اس حیلے کا مفہوم جسے کچھ لوگ افراط زر اور طلب و رسد کے عدم توازن کی وجہ سے کرنسی نوٹوں کی قوت خرید میں کمی کا علاج سمجھتے ہیں۔

درحقیقت نقود و رقیہ یعنی کاغذی نوٹوں کے ساتھ اب سونے کا کوئی قانونی تعلق باقی نہیں رہا بلکہ یہ

مستقل طور پر مال مثلی اور ثمن عرفی کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور سونے چاندی کے قائم مقام بن چکے ہیں اس لیے اس حیلے کے ذریعے پانچ ہزار دے کر چھ ہزار لینا اسی طرح کا سود ہو گا جس طرح کہ ایک تولہ سونا قرض دے کر سوا تولہ واپس لینا' یا ایک من گندم قرض دے کر ڈیڑھ من لینا سود ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ نوٹوں کی قیمت میں کمی ہو گئی ہے تو ہم فقہا کا یہ قاعدہ بیان کر چکے ہیں کہ قرض کی واپسی میں جنس اور مقدار میں برابری ضروری ہوتی ہے یعنی جتنا اور جیسا لیا تھا' اتنا ہی اور ویسا ہی واپس کرنا ہو گا۔ قیمت اور قوت خرید میں برابری اور مثلیت ضروری نہیں ہوتی۔ قوت خرید میں کمی بیشی تو سونے چاندی کے سکوں اور گندم و چاول میں بھی ہوتی ہے' لیکن ان میں کوئی نہیں کہتا کہ قرض کی ادائگی قیمت کے اعتبار سے کی جائے بلکہ سب کہتے ہیں کہ ادائگی جنس اور مقدار کے اعتبار سے کی جائے۔ جب ثمن خلقی یعنی سونے چاندی کے سکوں میں مثلیت اور برابری قیمت اور قوت خرید کے اعتبار سے نہیں' بلکہ مقدار کے اعتبار سے ملحوظ رکھی جاتی ہے تو ثمن عرفی اور زر قانونی یعنی کرنسی نوٹوں میں قوت خرید کے اعتبار سے مثلیت اور برابری کو کیوں ضروری سمجھا جاتا ہے؟ جب کہ یہ سونے چاندی کے سکوں کے قائم مقام ہیں۔

اس حیلے سے سود کا دروازہ کھل جائے گا۔ اگر مقصد کرنسی نوٹوں کو سونے کے ساتھ منسلک کرنا تھا اور واپسی سونے کی قیمت کے اعتبار سے کرنی تھی تو پھر اس حیلے کی کیا ضرورت تھی' سیدھے طریقے سے سونا دے کر سونا ہی واپس لیا جاتا۔ آج کل جو لوگ نوٹوں کا قرض لین دین کرتے ہیں ان کے ذہن میں یہ بات نہیں ہوتی کہ وصولی اور ادائگی سونے کی قیمت کے حساب سے کی جائے گی' حالانکہ ان کو علم ہوتا ہے کہ نوٹوں کی قیمت میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود نوٹوں کا قرض لین دین کرتے ہیں اس لیے کہ لوگ جانتے ہیں کہ اگر نوٹ ان کے جیب یا الماری میں موجود ہوتے' پھر بھی ان کی قوت خرید میں جو کمی آنی تھی وہ آ جاتی۔ جو نوٹ جیب میں رکھنے کے بجائے کسی کو قرض حسن دیے گئے ہوں' ان کی قوت خرید میں بھی جو کمی آنی تھی وہ آ گئی ہے۔ جس میں نہ قرض لینے والے کا کوئی قصور ہے اور نہ قرض دینے والے کا کوئی قصور ہے بلکہ یہ حالات اور طلب و رسد کے درمیان عدم توازن کا تقاضا ہے۔ یہ عدم توازن مصنوعی ہو یا فطری' اسے صبر و شکر کے ساتھ برداشت کر لینا چاہیے اور آیندہ کے لیے طلب و رسد کو متوازن بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

۲- اشیاے صرف کی قیمتوں کو معیار بنانا

افراط زر کی وجہ سے کرنسی نوٹوں کی قیمت میں کمی کی تلافی کے لیے اشاریہ بندی (indexation) کی تجویز بھی بار بار دہرائی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اشیاے صرف اور ضروریات زندگی کی قیمتوں کو معیار بنا کر قرض کا لین دین کیا جائے اور تمام حقوق و واجبات میں قیمتوں میں اضافے کے تناسب سے اضافہ کر دیا جائے۔ اگر چیزوں کی قیمتوں میں دس فی صد اضافہ ہوا ہے تو قرض اور دوسرے واجبات میں بھی دس

فی صد اضافہ کر دیا جائے یعنی ایک ہزار کے بدلے میں گیارہ سو دیے جائیں۔ اگر قیمتوں میں ۵۰ فی صد اضافہ ہوا ہے تو ادائگی بھی ۵۰ فی صد اضافے کے ساتھ کی جائے یعنی ایک ہزار کے بدلے میں ڈیڑھ ہزار۔

اشاریہ بندی کی یہ تجویز بھی سودی حیلوں میں سے ایک حیلہ ہے جو قرض کے بارے میں شرعی قاعدے سے متصادم ہے' اس لیے کہ کرنسی نوٹ کی حیثیت اب رسید کی نہیں ہے بلکہ یہ ایک زر قانونی اور ثمن عرفی ہے جو سونے چاندی کے سکوں کی جگہ لے چکا ہے۔ سونے چاندی یا دوسرے اموال ربویہ کے نقد تبادلے میں بھی قیمت اور مالیت کا کوئی اعتبار نہیں ہے بلکہ مقدار میں برابری ضروری ہے تو قرض اور ادھار میں قیمت کو کس طرح معیار بنایا جا سکتا ہے؟ اگر بیع صرف کے طور پر خالص چاندی کا ایک درہم دو کھوٹے درہموں کے بدلے میں فروخت کیا جائے یا خالص سونے کا ایک دینار دو کھوٹے دیناروں کے بدلے میں فروخت کیا جائے تو یہ ربا الفضل ہے اور حرام ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کے بدلے سونے اور چاندی کے بدلے چاندی کے مبادلے میں برابر برابر ہونا مطلقاً شرط قرار دیا ہے اور کھرے کھوٹے کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا۔ ایک حدیث میں تو صریح الفاظ میں فرمایا گیا ہے کہ "جید اور ردی دونوں برابر ہیں" (بدایہ کتاب البیوع باب الربا)۔ علامہ زیلعیؒ (م ۷۶۲ھ) اور علامہ بدر الدین عینیؒ (م ۸۵۵ھ) نے لکھا ہے کہ: "یہ حدیث اگرچہ غریب ہے لیکن اس کا مفہوم حضرت ابو سعید خدریؓ کی حدیث سے بھی اخذ کیا جا سکتا ہے" (نصب الرایہ اور البنایہ' باب الربا)۔

حضرت ابو سعیدؓ کی جس حدیث کا حوالہ زیلعی اور عینی نے دیا ہے اس میں مثلاً بمثل کے بعد وزناً بوزن کا لفظ بھی آیا ہے۔ ابن الہمامؒ نے فرمایا ہے کہ مثلاً لفظ عام ہے اس لیے وزناً کا اضافہ کیا گیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ تماثل اور برابری مقدار میں ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "برنی" اور "جنیب" یعنی عمدہ کھجور کی ایک صاع کے بدلے میں گھٹیا قسم کی کھجور کے دو صاع لینے دینے کو سود قرار دیا ہے' حالانکہ ان کی مالیت اور قوت خرید میں بڑا فرق ہوتا ہے (فتح القدیر)۔ انھی دلائل کی بنا پر فقہاے اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ "اموال ربویہ" میں جید اور ردی دونوں برابر ہیں الا یہ کہ درہم و دینار کا کھوٹ اور غش خالص چاندی اور سونے سے زیادہ ہو تو اس صورت میں درہم و دینار کی حیثیت عروض یعنی اشیاے استعمال اور سامان کی ہو گی جس کی بیع میں تماثل اور برابری شرط نہیں ہے بلکہ کمی بیشی بھی جائز ہے۔ اس لیے خالص چاندی کا ایک درہم دو ایسے درہموں کے بدلے میں فروخت کیا جا سکتا ہے جس کا کھوٹ چاندی کی مقدار سے زیادہ ہو (بدائع' ج ۵' ص ۲۲۰)۔

جب کرنسی نوٹ سونے چاندی کے سکوں کی جگہ لے چکے ہیں تو ان کے قرض لین دین میں بھی قیمت کا اعتبار نہیں ہو گا بلکہ مقدار اور جنس کا اعتبار ہو گا یعنی جس مالیت کے جتنے نوٹ دیے تھے' اسی مالیت کے اتنے ہی نوٹ واپس کرنے ہوں گے۔

اشاریہ بندی کی بنیاد پر قرض کی ادائگی میں دوسری خرابی یہ ہے کہ قرض کی ادائگی پہلے سے متعین مقدار کے مطابق کرنا لازم ہے اور اشاریہ بندی میں مقدار کا تعین تخمینی اور قیاسی طریقے پر ادائگی کے وقت کیا جاتا ہے اس لیے کہ قرض لیتے وقت معلوم نہیں کہ قیمتوں میں اضافہ کتنا ہوگا اور کن کن چیزوں کی قیمت بڑھے گی؟ ان وجوہات کی بنا پر اسلامی بنک کاری اور اسلامی شریعت دونوں کے ماہرین نے اشاریہ بندی کی تجویز کو مسترد کر دیا ہے اور متعدد بین الاقوامی سمی ناروں میں یہ طے ہو چکا ہے کہ یہ شرعی قواعد سے متصادم ہے اور افراط زر کے مسئلے کا حل بھی نہیں ہے۔

بعض لوگوں نے اشیاے صرف کی قیمتوں کے تناسب سے قرض کی مقدار میں اضافہ کرنے (اشاریہ بندی) کے لیے امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد قاضی ابویوسفؒ کی رائے کو دلیل بنایا ہے جن کی رائے آخر میں یہ بنی تھی کہ فلوس یعنی سونے چاندی کے علاوہ دوسرے دھاتی سکوں کی قیمت میں اگر کمی بیشی ہو گئی ہو تو قرض کی ادائگی فلوس کی اس قیمت کے مطابق کی جانی چاہیے جو قرض لینے کے وقت یا بیع کے وقت تھی۔ کرنسی نوٹ بھی چونکہ فلوس کی طرح ثمن عرفی ہیں، ثمن خلقی نہیں ہیں، اس لیے ان کے لین دین میں بھی مقدار کی بجائے قیمت اور قوت خرید کو معیار بنانا چاہیے۔ سودی حیلوں کے عادی لوگوں کو اگر تقلید ہی کرنی تھی تو بہتر یہ تھا کہ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی تقلید کر لیتے، جن کی رائے یہ ہے کہ فلوس جب تک مارکیٹ میں بطور ثمن چل رہے ہوں (نافق ہوں کاسد نہ ہوں) اس وقت تک ادائگی بالمثل ضروری ہوگی۔ یعنی جتنے سکے بطور قرض یا بطور ثمن واجب الادا تھے اتنے ہی واپس کرنے ہوں گے اور قوت خرید میں کمی بیشی کی وجہ سے واجب الادا فلوس کی مقدار میں کمی بیشی جائز نہیں ہوگی۔ البتہ اگر دھاتی سکے کاسد ہو گئے ہوں یعنی بازار میں ان کا چلن بالکل ختم ہو گیا ہو تو پھر قرض لیتے وقت یا بیع کے وقت ان کی جو قیمت تھی اس کے اعتبار سے مروجہ سکوں میں ادائگی کی جائے گی۔ اس لیے کہ بطور ثمن ان کا چلن ختم ہونے کی وجہ سے ان کی حیثیت سامان تجارت کی ہو گئی ہے جیسے تانبا، لوہا اور چاندی وغیرہ (بدائع، شرح المہذب، المدونہ اور المغنی)۔

دوسری بات یہ ہے کہ امام ابویوسفؒ نے جس بنیاد پر ادائگی بالقیمت کا فتویٰ دیا تھا وہ یہ تھی کہ فلوس کا تعلق اس دور میں سونے اور چاندی کے ساتھ تھا اور یہ درہم کی ریزگاری تھی، مثلاً درہم اگر دس فلوس کا ہو تو ایک فلس درہم کا دسواں حصہ بنتا ہے۔ اس اعتبار سے دس فلوس قرض لینا ایک درہم قرض لینے کے برابر ہے اور جب فلوس کی قیمت میں کمی آ جائے تو اس صورت میں دس فلوس ہی واپس کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ درہم کا دسواں حصہ کم دیا ہے، اور گیارہ فلوس دینے کے معنی یہ ہیں کہ جو درہم لیا تھا، وہی پورے کا پورا واپس کر دیا ہے۔ اس لیے کہ فلوس درہم کے اجزا اور ریزگاری کی حیثیت رکھتے تھے، مستقل ثمن کی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ یہ اصل میں نادار اور تنگ دست لوگوں کے لیے بنائے جاتے تھے

تا کہ وہ ان کے بدلے میں اپنی ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں خرید سکیں کیونکہ سونے چاندی کے سکے یعنی درہم اور دینار قیمتی چیزوں کی خریداری کے لیے یا زیادہ مقدار میں خریداری کرنے کے لیے استعمال ہوتے تھے جو تنگ دست اور نادار لوگوں کے پاس نہیں ہوتے تھے۔ لیکن کرنسی نوٹوں کی حیثیت اب سونے چاندی کی رسید اور وثیقے کی نہیں ہے اور یہ درہم و دینار کے اجزا اور ریزگاری بھی نہیں ہیں بلکہ مستقل طور پر ثمن عرفی اور زر قانونی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے جب تک یہ منسوخ نہ ہوئے ہوں اور ان کا چلن بالکل ختم نہ ہوا ہو اس وقت تک ان کی ادائیگی بالمثل ضروری ہوگی یعنی جتنے لیے تھے اتنے ہی واپس کرنے ہوں گے۔

ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاے اسلام کے مقابلے میں امام ابو یوسفؒ کے قول ثانی کو ترجیح دینا مناسب نہیں ہے، جب کہ ان کا پہلا قول ائمہ اربعہ کی رائے کے مطابق تھا۔ اگر ان کی رائے کو ترجیح دی بھی جائے، جیسا کہ علامہ شامیؒ نے بعض حنفی فقہا کے حوالے سے کہا ہے کہ فتویٰ ابو یوسفؒ کے قول ثانی پر دیا گیا ہے، پھر بھی آج کل کے کرنسی نوٹوں کو فلوس پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ دونوں کے درمیان فرق ہے۔ پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل کا متفقہ فیصلہ بھی یہی ہے کہ اشیا کی قیمتوں کو قرض لین دین یعنی اشاریہ بندی کی شریعت میں کوئی گنجایش اور وجہ جواز موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ۱۴۰۷ھ میں اسلامی ترقیاتی بنک جدہ اور بین الاقوامی ادارہ براے اسلامی اقتصادیات اسلام آباد دونوں کے زیر اہتمام جو سیمی نار منعقد ہوا تھا جس میں مختلف ممالک کے ماہرین شریعت اور ماہرین معیشت نے شرکت کی تھی، اس کا متفقہ فیصلہ بھی یہی تھا کہ: "کرنسی نوٹ تمام معاملات میں درہم اور دینار کی طرح ہیں اور امام ابو یوسفؒ کا فلوس کے بارے میں یہ قول کہ ان کی قیمت میں کمی بیشی کی صورت میں قرضوں کی ادائیگی اسی قیمت کے تناسب سے کی جائے گی، کرنسی نوٹوں میں جاری نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ یہ کرنسی نوٹ نقدین (درہم و دینار) کے قائم مقام ہیں اور نقدین کی قیمت بڑھنے اور گھٹنے کا معتبر نہ ہونا متفق علیہ ہے۔ سود اور قرض کی احادیث میں مثلیت اور برابری سے جنس اور قدر یعنی ناپ تول اور عدد میں برابری مراد ہے، قیمت میں برابری مراد نہیں ہے۔ یہ بات اموال ربویہ کے تبادلے سے متعلق احادیث سے پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اسی پر امت کا اجماع ہے اور اسی پر عمل جاری ہے، ہر قسم کے دیون کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ منسلک کرنا جائز نہیں" (فقہی مقالات از مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی، ج ۱، ص ۷۲ ملخصاً)۔

جب سود کا شرعی اور حلال متبادل موجود ہے تو اشاریہ بندی کے اس سودی حیلے پر آخر کیوں اصرار کیا جا رہا ہے، جب کہ اسے ماہرین شریعت نے مسترد کر دیا ہے اور ماہرین معیشت کے نزدیک بھی یہ افراط زر کا حل نہیں ہے۔

۳۔ قرض کی واپسی جنس کی صورت میں طے کرنا

بعض حلقوں کی جانب سے یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ قرض کی واپسی جنس کی صورت میں کی جائے' مثلاً دس ہزار روپے کے نوٹ دیتے وقت یہ طے کر لیا جائے کہ ادائیگی کے وقت دس ہزار روپے کی جتنی گندم ملتی ہو' وہ دی جائے گی' اس طرح کرنسی کی قیمت میں کمی کی تلافی ہو جائے گی۔ لیکن یہ تجویز بھی ایک قسم کا سودی حیلہ ہے۔ یہ تین وجوہات کی بنا پر شرعی قواعد سے متصادم ہے۔ اول: قرض کی واپسی بالمثل ضروری ہے اور اس تجویز میں نوٹوں کے بدلے میں گندم یا کوئی اور جنس دینا طے کیا جاتا ہے۔ دوم: واجب الادا قرض کی مقدار کا پہلے سے تعین ہونا ضروری ہے اور اس تجویز کی رو سے اس جنس کی مقدار کا پہلے سے تعین نہیں ہو سکتا اور ادائیگی کے وقت بھی مقدار کا تعین نزاع کا ذریعہ بن سکتا ہے اس لیے کہ مختلف علاقوں اور شہروں بلکہ دکانوں کے نرخ بھی الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ سوم: ادھار گندم کے بدلے میں پیشگی رقم دینا بیع سلم کی طرح کا معاملہ ہے مگر اسے نام دیا گیا ہے قرض کا' حالانکہ دونوں کے درمیان فرق ہے کہ بیع میں نفع جائز ہے اور قرض پر نفع لینا حرام ہے۔ دو قسم کے معاہدے ایک ہی چیز میں بیک وقت نہیں کیے جا سکتے۔ اگر دس ہزار روپے قرض دیے گئے ہیں تو ادائیگی بالمثل کرنی ہو گی' یعنی دس ہزار رپے کے نوٹ واپس کرنے ہوں گے۔ اگر یہ رقم گندم کی قیمت ہے تو پھر بیع سلم کی شرائط پوری کرنی ہوں گی جن میں سے ایک شرط یہ ہے کہ جنس اور قیمت دونوں کی مقدار معاہدے کی مجلس میں متعین کی جائے۔ لہٰذا یہاں گندم کی مقدار ادائیگی کے وقت متعین کی جائے گی۔

۴۔ احسان کے بدلے احسان کی تدبیر

بعض لوگوں نے سود کے متبادل کے طور پر "حسن القضا" کے نام سے ایک نظام بنانے کی تجویز پیش کی ہے جس کا خاکہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ بنک چھ ماہ یا ایک سال یا کم و بیش مدت تک کھاتہ داروں کی رقوم استعمال کرنے کے بعد ان کو احسان کے بدلے احسان کے طور پر کچھ اضافی رقم ادا کرے۔ اضافی رقم کی مقدار کا تعین کرتے وقت مجموعی قومی آمدنی میں اضافے کو' افراط زر کی وجہ سے کرنسی کی قیمت میں کمی کو' اور کاروبار میں نفع کے تناسب کو ملحوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اس اضافی رقم کا اعلان ہر مالی سال کے اختتام پر کیا جانا چاہیے مگر ساتھ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ یہ اضافی رقم قرض کا نفع نہیں ہے بلکہ "حسن القضا" کے نظام کے تحت دیا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک حیلہ ہے جو سود کو احسان و انعام کے نام سے جاری رکھنے کے لیے پیش کیا گیا ہے۔

جو چیز مروج اور معروف ہو چکی ہو' اس کا حکم وہی ہوتا ہے جو مشروط چیز کا ہوتا ہے۔ چونکہ قرض پر مشروط اضافہ جائز نہیں ہے تو معروف اضافہ بھی جائز نہیں ہے۔ جب قرض پر اضافی رقم دینے کا باقاعدہ نظام بنایا جائے' اس کا اعلان کیا جائے اور یہ بنکوں اور کھاتہ داروں کے درمیان معاہدے کے بغیر ایک معمول بن جائے تو یہ کالمشروط نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اس نظام کے تحت جو بھی قرض دے گا تو اسی نیت سے

دے گا کہ مجھے انعام کے نام پر کچھ اضافہ بھی ملے گا۔ جب یہ معاشرے کا رواج بن جانے کا تو عملاً یہ ایک غیر تحریری قانون بن جائے گا جس پر عدالتیں فیصلہ بھی کریں گی۔ "حسن القضا" کی احادیث کا مفہوم تو یہ ہے کہ شرط اور عرف و رواج کے بغیر مدیون دائن کو بطور احسان کچھ زائد رقم دے دے تو یہ جائز ہے بلکہ بہتر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ سود کے عادی ہو چکے ہیں اس لیے حیلوں' بہانوں اور چور دروازوں کے ذریعے اسی ظالمانہ نظام کو بحال رکھنا چاہتے ہیں اور ان کو ایسے نام نہاد دانشور اور وکیل بھی مل جاتے ہیں جو انھیں حیلے اور چور دروازے بتاتے رہتے ہیں۔

۵- قرض دینے والوں کو سرکاری واجبات اور ٹیکسوں میں رعایت دینا

یہ تجویز بھی پیش کی جاتی ہے کہ قرض دینے کا رجحان بڑھانے اور ترغیب دلانے کے لیے قرض دینے والوں کو ٹیکسوں اور دوسرے سرکاری واجبات میں ایک مخصوص حد تک رعایت دی جائے۔ یہ بھی رعایت اور ترغیب کے نام پر ایک سودی حیلہ ہے جو ایجاد کیا گیا ہے۔

ٹیکس اور سرکاری واجبات اگر ظالمانہ ہوں تو ان کو ختم کرنا ضروری ہے اور کسی سے بھی وصول کرنا جائز نہیں لیکن اگر عادلانہ ہوں تو قرض دینے والوں کو ان میں چھوٹ اور رعایت دینا دراصل قرض کے بدلے میں نفع پہنچانا ہے جو سود ہے۔ اگر کسی کو اس کی اقتصادی حالت یا اس کی قومی اور ملی خدمت کی وجہ سے واجبات میں رعایت دی گئی ہو تو یہ انعام یا اعانت ہے اور جائز ہے' لیکن جب اسے یہ رعایت قرض دینے کی وجہ سے دی گئی ہو تو نہ یہ انعام ہے اور نہ اعانت بلکہ ربا ہے۔ دائن کا اپنے مدیون سے تحفہ لینا بھی جائز نہیں ہے' جیسا کہ حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا: "تم میں سے کوئی شخص اپنے کسی بھائی کو قرض دے' پھر اس کا مقروض اسے کھانے کا خوانچہ تحفے کے طور پر بھیجے تو وہ اسے قبول نہ کرے یا وہ اپنی سواری پر سوار کرنا چاہے تو اس پر سواری نہ کرے' سوائے اس صورت کے کہ ان دونوں کے درمیان پہلے سے ہدیہ لینے دینے کے تعلقات جاری ہوں" (ابن ماجہ' کتاب الصدقات باب القرض)۔

حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کے بیٹے سعید کو کہا تھا کہ: "جب تمھارا کسی پر کوئی حق ہو اور وہ تمھیں گھاس یا جو کا یا چارے کا کوئی گٹھا تحفے کے طور پر بھیجے تو اسے قبول نہ کرو کیونکہ یہ بھی سود ہے" (بخاری' باب مناقب عبداللہ بن سلام)۔ جب تحفہ لینا دینا جائز نہیں ہے تو واجبات میں چھوٹ اور رعایت لینا دینا کس طرح جائز ہو سکتا ہے؟

۶- کرنسی نوٹوں کا زیادہ قیمت پر فروخت کرنا

بعض لوگوں نے سودی سکیموں کو نئے نام سے جاری رکھنے کے لیے یہ حیلہ نکالا ہے کہ نوٹوں کو زیادہ

قیمت پر فروخت کیا جائے' مثلاً ۱۰ ہزار کے نوٹ ۱۲ ہزار کے عوض اور ۱۰ لاکھ کے نوٹ ۱۲ لاکھ کے عوض مانگنے والے پر ادھار فروخت کر دیے جائیں' مگر اسے قرض کا نام نہ دیا جائے۔ اس طرح یہ ۲ ہزار یا ۲ لاکھ قرض پر اضافہ نہیں ہو گا بلکہ نوٹوں کی قیمت فروخت میں اضافہ ہو گا جو حلال ہے۔ اس کی دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ نوٹوں کا حکم فلوس کی طرح ہے اور امام شافعیؒ کا مسلک اور امام احمدؒ کا ایک قول یہ ہے کہ ایک سکے کو دو سکوں کے بدلے میں بیچنا جائز ہے۔ اس لیے کہ فلوس میں ثمنیت عرفی ہے' خلقی نہیں ہے اور ربا الفضل کی حرمت خلقی اثمان یعنی سونے چاندی کے ساتھ مخصوص ہے۔ لہٰذا فلوس کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے (نہایة المحتاج از علامہ رملیؒ' ج ۳' ص ۱۴۷ اور فتاویٰ ابن تیمیہ' ج ۲۹' ص ۴۶۰)۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کی رائے یہ ہے کہ فلوس کا کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ جائز ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ بائع اور مشتری میں سے کسی ایک نے بیع و شراء کی مجلس میں الگ ہونے سے پہلے اپنے فلوس پر قبضہ کر لیا ہو۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک فلوس کا تعلق قبضے کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ جب کسی ایک نے بھی قبضہ نہ کیا ہو تو یہ ادھار کی بیع ادھار سے ہو گی جو ممنوع ہے۔ مگر امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام محمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ فلوس جب تک بازار میں چل رہے ہوں تو ان کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب تک ان سکوں کا بطور ثمن چلن ختم نہ ہو جائے اس وقت تک صرف بائع و مشتری ان کی ثمنیت کو باطل کر کے ان کو عروض اور سامان کی حیثیت نہیں دے سکتے بلکہ ان کے ثمن اصطلاحی کی حیثیت برقرار رہے گی اور اثمان کا باہمی تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں ہے۔ اس لیے ایک سکے کا دو سکوں سے تبادلہ جائز نہیں ہے (فتح القدیر' باب الربا)۔

دلائل کے اعتبار سے امام محمدؒ اور امام مالکؒ کی رائے مضبوط ہے۔ اس لیے کہ جب فلوس میں ثمنیت عرف عام اور رواج عام کی وجہ سے آئی ہے تو اسے عرف عام ہی ختم کر سکتا ہے' دو یا چند افراد ختم نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر دوسری رائے کو ترجیح دے دی جائے پھر بھی اس کا اطلاق کرنسی نوٹ پر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ یہ نوٹ اب مستقل طور پر زر قانونی اور ثمن عرفی بن چکے ہیں۔ اور درہم و دینار کی جگہ لے چکے ہیں اس لیے ۱۰ ہزار نوٹوں کا تبادلہ ۱۲ ہزار نوٹوں کے ساتھ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ۱۰ ہزار درہم کو ۱۲ ہزار کے بدلے میں فروخت کرنا۔ ظاہر ہے کہ یہ تو عین ربا ہے۔

یہ حیلہ دوسرے حیلوں سے زیادہ خطرناک ہے۔ اس لیے کہ جو شخص بھی سود پر قرض دینا چاہتا ہو وہ اپنے کرنسی نوٹ زیادہ قیمت میں فروخت کر کے بڑی آسانی سے سود حاصل کرے گا۔ اس طرح سود کا دروازہ چوپٹ کھل جائے گا۔ البتہ مختلف ممالک کی کرنسیوں کی خرید و فروخت کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے۔ مثلاً پونڈ کو ۸۰ روپے میں بیچنا' ڈالر کو ۵۰ روپے میں فروخت کرنا اور اسی طرح دوسرے نوٹوں کا پاکستانی کرنسی کے ساتھ تبادلہ کرنا جائز ہے۔ اس لیے کہ مختلف ملکوں کی کرنسیاں مختلف اجناس ہیں۔

۷- بیع عینہ

سودی ذہنیت رکھنے والے سوداگروں نے بیع کے نام سے ایک اور حیلہ ایجاد کیا ہے جس کو "بیع عینہ" کہتے ہیں۔ اس کی فقہی تعریف یہ ہے: "بیع عینہ یہ ہے کہ کسی چیز کو ادھار قیمت پر فروخت کیا جائے، پھر لوٹ کر اسی چیز کو خریدار سے کم قیمت پر خرید لیا جائے" (نصب الرایہ ج ۴، ص ۱۶)۔

اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص نے کسی سودی ذہنیت والے تاجر سے ۴ ماہ کے لیے سو روپے قرض حسن مانگا۔ اس نے قرض دینے کے بجائے سو روپے کا ایک کپڑا ۱۱۸ روپے ادھار میں فروخت کر دیا۔ جب خریدار نے اس کو قبضے میں لے لیا تو اسی تاجر نے وہی کپڑا اس سے سو روپے نقد دے کر واپس خرید لیا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں کپڑے کی خرید و فروخت مقصد نہیں ہے بلکہ قرض لین دین کا معاملہ اصل مقصد ہے۔ قرض مانگنے والے کو سو روپے کی ضرورت ہے اور دینے والے کو سو روپے پر ۱۸ روپے سود لینے کی خواہش ہے۔ اس لیے انھوں نے عقد بیع کو سودی لین دین کا ایک ذریعہ اور حیلہ بنایا ہے۔ کپڑا واپس تاجر کے پاس آگیا جسے وہ کسی اور خریدار کو فروخت کر کے اپنے سو روپے لے لے گا اور ۴ ماہ بعد ۱۱۸ روپے وصول کر لے گا۔ یہ فی الحقیقت سو روپے قرض پر ۱۸ روپے سود لینے دینے کا معاملہ ہے۔ ابن الہمامؒ نے اس کو عینہ کہنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس میں بعینہ وہی چیز بائع کے پاس لوٹ آتی ہے جو دی گئی تھی۔ ابن نجیمؒ نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ اس میں قرض مانگنے والے کو نقد روپے دینے کے بجائے ایک متعین چیز (عین) دی گئی ہے۔ بیع عینہ دراصل سود کا چور دروازہ ہے۔ اسی لیے رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے کہ: "جب تم آپس میں بیع عینہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت مسلط کریں گے" (ابوداود باب النہی عن العینہ)۔ اس حدیث کی ابوداؤد کی سند اگرچہ ضعیف ہے لیکن امام احمدؒ کی کتاب الزہد میں یہ صحیح سند کے ساتھ بھی نقل ہوئی ہے (نصب الرایا، ج ۴، ص ۱۶-۱۷)۔

بیع عینہ کے ممنوع ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ: "حضرت عائشہؓ کے پاس کوفہ کی ایک عورت آئی اور پوچھا کہ میں نے حضرت زیدؓ بن ارقم کو ایک کنیز ۸ سو روپے ادھار میں فروخت کی تھی اور پھر وہی کنیز ان سے ۶ سو روپے نقد میں واپس خرید لی۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: تم دونوں نے برا کام کیا ہے۔ میرا یہ پیغام زیدؓ بن ارقم کو پہنچا دو کہ تم نے رسولؐ اللہ کے ساتھ جو حج اور جہاد کیا تھا وہ ضائع کر دیا الا یہ کہ وہ اس سے توبہ کر لیں (مصنف عبدالرزاق، ج ۸، ص ۱۸۵)۔ یہ حدیث مسند احمد اور سنن کبریٰ للبیہقی میں بھی نقل ہوئی ہے۔ علامہ جمال الدین زیلعیؒ نے اس کی سند کو جید کہا ہے اور ضعیف کہنے والوں کے اعتراضات کا جواب دیا ہے (نصب الرایا، ج ۴، ص ۱۵-۱۶)۔

مذکورہ روایات کی بنا پر امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے بیع عینہ کو ممنوع قرار دیا ہے (الجوہر النقی فی ذیل البیہقی، ج ۵، ص ۳۳۰)۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں اس بیع سے

نفرت پہاڑوں کی طرح ہے۔ یہ ایک مذموم بیع ہے جس کو سود خوروں نے گھڑلیا ہے اور رسولؐ اللہ نے اس کی مذمت کی ہے (فتح القدیر، ج ۷، باب الکفالہ ص ۲۱۲-۲۱۳)۔ امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ اگر ادھار فروخت کرتے وقت دوبارہ کم قیمت پر خریدنے کی شرط نہیں لگائی گئی تھی تو اس صورت میں بیع عینہ جائز ہے کیونکہ جب مشتری خریدی ہوئی چیز کا مالک بن گیا ہو تو اپنی دوسری املاک کی طرح اسے بھی جتنی قیمت پر اور جیسے چاہے فروخت کر سکتا ہے۔ عینہ کی مذمت کی احادیث ان کے نزدیک ضعیف ہیں (مختصر المزنی فی آخر کتاب الام، ص ۸۵)۔ لیکن شافعیہ میں سے ابو اسحٰق اسفرائینیؒ اور شیخ ابو محمدؒ نے فرمایا ہے کہ: "جب اس قسم کی بیع لوگوں کی عادت بن جائے اور مروج ہو جائے تو بیع ثانی، بیع اول کے وقت مشروط کی طرح ہو جاتا ہے اور دونوں باطل ہو جاتے ہیں" (روضۃ الطالبین، ج ۳، ص ۸۲)۔

معلوم ہوا کہ عینہ کا یہ حیلہ جب معروف ہو جائے اور لوگوں کا معمول بن جائے تو المعروف کالمشروط کے قاعدے کی وجہ سے شافعیہ کے نزدیک بھی باطل ہو گا اور اس صورت میں چاروں ائمہ کے نزدیک ممنوع ہو گا۔ حنفیہ میں سے امام ابو یوسفؒ بھی جواز کے قائل ہیں لیکن علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ امام ابو یوسفؒ سے جواز کی جو روایت آئی ہے وہ اس صورت کے بارے میں ہے کہ فروخت شدہ چیز دوبارہ لوٹ کر بائع کے پاس نہ آئے بلکہ خریدار نے نقد رقم حاصل کرنے کے لیے بازار میں کسی اور شخص پر جو بائع اول کا ایجنٹ اور کارندہ نہ ہو، کم قیمت میں فروخت کر کے اپنی مطلوبہ رقم نقد حاصل کر لی ہو۔ بعض اہل علم اس کو بھی بیع عینہ کہتے ہیں۔ امام ابویوسفؒ نے اس قسم کی عینہ کو جائز کہا ہے اور امام محمدؒ نے جس قسم کی عینہ کی شدید مذمت کی ہے وہ یہ ہے کہ فروخت شدہ چیز دوبارہ کم قیمت پر واپس بائع کے پاس آ جائے (رد المحتار، ج ۴، ص ۳۸۷)۔ بہرحال بیع عینہ ایک "حیلہ ربویہ" ہے جس کو اختیار کرنے اور اس کے مطابق بنک کاری کا نظم چلانے سے سودی نظام بحال رہے گا۔

فقہ کی کتابوں میں مشائخ بلخ کا قول نقل ہوا ہے کہ بیع عینہ ان بیوع سے بہتر ہے جو آج ہمارے بازاروں میں رائج ہیں۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ عینہ جائز ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ عینہ سے زیادہ قباحت والے بیوع ہماری مارکیٹ میں رائج ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض مشائخ کے اقوال، احادیث و آثار اور ائمہ مجتہدین کی آرا کے مقابلے میں قابل اعتنا بھی نہیں ہو سکتے۔ جمہور فقہا کی مدلل رائے کو نظرانداز کر کے شاذ قسم کی آرا تلاش کرنا اور ان کو بطور دلیل پیش کرنا بحث و تحقیق کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔

۸- بیع الوفا

سودی ذہنیت والوں نے رہن شدہ چیز سے نفع اور آمدن حاصل کرنے کے لیے "بیع الوفا" کے نام سے ایک حیلہ ایجاد کیا ہے جس کی تعریف یہ ہے: "بیع الوفا یہ ہے کہ بائع، خریدار سے کہے کہ میں نے یہ چیز تم پر فروخت کر دی ہے مگر شرط یہ ہے کہ میں جب ثمن (یعنی طے شدہ قیمت) واپس کروں گا تو یہ چیز دوبارہ

مجھے (اسی قیمت میں) فروخت کرو گے" (رد المحتار' ج ۴' ص ۳۴۱)۔

ابن عابدینؒ نے کفایہ شرح بدایہ سے اس کی تعریف اس طرح نقل کی ہے کہ: "بیع الوفا یہ ہے کہ بائع' خریدار کو کہے کہ تیرا مجھ پر جو قرض ہے اس کے بدلے میں' میں نے یہ چیز تم کو فروخت کر دی ہے مگر شرط یہ ہے کہ جب بھی میں تیرا قرض ادا کر دوں تو یہ چیز دوبارہ میری ہو جائے گی۔

بہرحال الفاظ دوبارہ لوٹانے کے ہوں یا دوبارہ فروخت کرنے کے ہوں' دونوں کو "بیع الوفا" کہا جاتا ہے اس کا حکم کیا ہے؟ اس بارے میں مالکیہ' حنابلہ اور متقدمین حنفیہ اور شافعیہ کا مسلک تو یہ ہے کہ یہ بیع فاسد ہے۔ اس لیے کہ ثمن کی واپسی پر دوبارہ بائع کو فروخت کرنے کی شرط عقد بیع کے تقاضے کے خلاف ہے کیونکہ بیع کا تقاضا یہ ہے کہ مبیع کا مشتری کی ملکیت میں آ جانے کے بعد اس کو اختیار ہے کہ کسی کو فروخت کرے یا اپنے پاس ہی رکھے۔ فروخت کرنے کی صورت میں بھی اس پر یہ پابندی نہیں لگائی جا سکتی کہ جس سے خریدی تھی اسی کو فروخت کرو اور اسی قیمت پر فروخت کرو جو دی گئی تھی۔

اس کے علاوہ قاعدہ یہ ہے کہ عقود میں الفاظ کی بجائے مقاصد کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اور اس بیع میں ثمن کی واپسی کے وقت فروخت شدہ چیز کی واپسی کی شرط لگانے سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ "رہن" ہے بیع نہیں ہے کیونکہ قرض کی ادائیگی کے وقت رہن شدہ چیز واپس کی جاتی ہے۔ فروخت شدہ چیز واپس نہیں کی جاتی۔ دراصل اس نام نہاد بیع کے پیچھے سودی حیلہ کارفرما ہے۔ "مرھونہ" [جسے رہن رکھا جائے] سے نفع حاصل کرنا چونکہ ربا ہے اور حرام ہے اس لیے حیلے کے طور پر "مرھونہ" کو مبیع کا نام دیا گیا ہے جس سے نفع حاصل کرنا ربح ہے اور حلال ہے۔ حنفیہ اور شافعیہ میں سے بعض متاخرین نے کہا ہے کہ بیع الوفا پر بیع کا یہ حکم تو مرتب ہوتا ہے کہ خریدنے والا خریدی ہوئی چیز سے نفع اٹھا سکتا ہے لیکن اس پر رہن کا حکم بھی مرتب ہوتا ہے کہ مشتری اسے بائع کے علاوہ کسی کو بیچ نہیں سکتا۔ اگرچہ یہ قواعد کے خلاف ہے لیکن لوگوں کے تعامل کی وجہ سے جائز ہے (الموسوعۃ الفقہیہ الکویتیہ' ج ۹' ص ۲۶۰' طبع کویت' ۱۹۸۷)۔

متاخرین میں سے سب نے نہیں بلکہ بعض نے جواز کی جو دلیل دی ہے وہ کمزور ہے اس لیے کہ تعامل اور عرف و رواج اگرچہ معتبر ہے لیکن حرام کو حلال کرنے کا حیلہ اگر عام ہو جائے اور لوگوں کا معمول بن جائے تو اس سے وہ حیلہ جائز نہیں ہو سکتا۔ عرف و تعامل پر مباحات اور مصالح مرسلہ سے تعلق رکھنے والے معاملات میں فیصلہ کیا جا سکتا ہے مگر محرمات و مکروہات تو ظاہر ہے کہ عرف و رواج سے جائز نہیں ہو سکتے۔ بیع الوفا کے بارے میں ابن نجیمؒ نے بحر الرائق' باب خیار الشرط میں آٹھ اقوال نقل کیے ہیں اور فتاویٰ بزازیہ' باب البیع الفاسد میں نو اقوال نقل کیے گئے ہیں لیکن یہ سب طول لاطائل اور بحث لاحاصل ہے۔ اس کا صحیح حکم دولت عثمانیہ کے ممتاز فقیہہ شیخ بدر الدین بن قاضیؒ سماوہ (م ۸۱۸ھ) نے بیان

کیا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب جامع الفصولین کی فصل نمبر ۱۸ میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

"بیع وفا درحقیقت رہن ہے جس سے خریدی ہوئی چیز خریدار کی ملک میں داخل نہیں ہوتی اور نہ وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ الا یہ کہ مالک بطیب خاطر اور اپنی دلی رضامندی سے اسے فائدہ اٹھانے کی اجازت دے دے۔ اگر خریدار نے بیع وفا کے طور پر خریدے گئے باغ کا پھل کھایا ہو یا اس کا کوئی درخت ضائع کر دیا ہو تو وہ اس کے تاوان کا ذمہ دار ہو گا"۔

بائع جب قرض ادا کرے گا تو اپنی چیز واپس لے لے گا۔ ہمارے نزدیک بیع وفا اور رہن کے درمیان احکام کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے اس لیے کہ بائع اور مشتری دونوں نے اگرچہ اس کو بیع کا نام دیا ہے لیکن ان کا مقصد رہن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے زمانے میں بیع وفا کا معاملہ کرنے والے بعد میں لوگوں کے سامنے کہتے ہیں کہ میں نے اپنی فلاں چیز فلاں کے پاس رہن رکھ دی ہے اور خریدار کہتا ہے کہ میں نے فلاں سے اس کی فلاں چیز اپنے پاس گروی رکھ لی ہے۔ درحقیقت معاملات میں مقاصد و معانی معتبر ہوتے ہیں الفاظ اور حروف نہیں۔ جامع الفصولین کے محشی شیخ نجم الدین رملیؒ نے بھی شیخ بدرالدینؒ کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"بیع وفا درحقیقت رہن ہے اور اس کا حکم وہی ہے جو رہن کا ہے۔ محمد بن فضل بخاری نے بھی اسی طرح کہا ہے اور یہی صحیح ہے۔ اگرچہ بعض علما نے کہا ہے کہ یہ بیع فاسد ہے جو قبضہ مکمل ہونے کے بعد مشتری کی ملکیت کا موجب ہو جاتا ہے لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے (جامع الفصولین' ج ۱' ص ۲۳۴' طبع کراچی' ۱۳۰۲ھ)۔

سودی حیلوں کے زیر عنوان میں نے ۸ حیلے بطور نمونہ نقل کیے ہیں ورنہ سودی ذہنیت رکھنے والے قسم قسم کے حیلے بہانے گھڑتے رہتے ہیں۔ اللہ ہم سب پر رحم فرمائے آمین! (یہ تحریر سپریم کورٹ کی شریعت اپیلیٹ بنچ میں سود کے مسئلے پر حکومت کی اپیل کی سماعت کے موقع پر دیے گئے بیان کا ایک حصہ ہے)

بھائیو اور بہنو!

اگر ہمارے سامنے کوئی برائی کا کام ہو رہا ہے' نہ ہم اسے ہاتھ سے روکیں' نہ زبان سے برا کہیں' نہ ہی دل میں برا سمجھیں تو آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے پیارے رسولؐ نے اس کے بارے میں کیا کہا ہے؟ یہ کہ اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔

برائی کے بارے میں لاتعلقی اور بے نیازی' اسے ہونے دینا' یہ ہمارے مسلمان ہونے کی شان کے خلاف ہے۔ کجا یہ کہ ہم اس سے لطف لیں' اس میں شریک ہوں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے غضب کو بھڑکانا اور عذاب کو بلانا ہے۔

آپ جس بس میں سفر کر رہے ہیں' اگر اس میں عریاں اور فحش ناچ گانوں پر مشتمل فلم دکھائی جا رہی ہے تو اسے روکنا آپ اپنا کام سمجھیں۔

آپ سب مل کر کہیں گے تو لازماً یہ فلم بند کر دی جائے گی۔

کیوں نہ آپ نیکی کا یہ کام کریں' اپنے اللہ کو راضی کریں!

آپ کا خیر خواہ

گزارش ہے کہ اس صفحے کی نقل سواریوں میں تقسیم کریں اور ڈرائیور کو بھی دیں۔
اللہ سے دعا بھی کریں کہ وہ رفقائے سفر کو ہدایت دے اور ہم سب کو اپنے عذاب سے بچائے۔

یادرفتگاں

سعدالدینؒ ..... ایک انقلابی شخصیت

سید علی گیلانی ٥

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز!

(بال جبریل، ص ۹۷-۹۸)

علامہ اقبالؒ نے مومن بندوں کی جو صفات گنائی ہیں، بغیر کسی مبالغہ اور غلو کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مرحوم سعدالدینؒ ان جملہ صفات کے حامل تھے۔ ہم نے ان کے ساتھ زندگی کے ۴۰ سال گزارے ہیں۔ اس طویل عرصے میں ہم نے ان کو بہت قریب سے دیکھا ہے، سنا ہے، پڑھا ہے، ان کی زندگی جتنی صاف و شفاف تھی، شاید ہی ہم میں سے کوئی اس معیار پر پورا اترتا ہو۔ انھوں نے ایسے خاندان میں جنم لیا، پرورش پائی، بچپن اور لڑکپن گزارا، ابتدائی تعلیم کے مراحل طے کیے، جو خاندان نہ صرف جموں و کشمیر کی حدود میں بلکہ پاک و ہند کے شہروں اور قریوں میں، بزرگی، خدا رسیدگی، روحانیت اور طریقت میں مرجع و عام تھا۔ انھوں نے قرآن پاک کی تعلیم سے تعلیمی زندگی کی ابتدا کی اور اللہ بزرگ و برتر نے ان کو یہ سعادت عظمیٰ عطا کی کہ وہ قرآن کے حافظ ہوئے۔ حفظ قرآن کے بعد انھوں نے مروجہ تعلیم کی طرف توجہ دی۔ وہ ایف ایس سی تک سائنس اسٹوڈنٹ رہے اور پھر بی اے کیا۔

اس زمانے میں مسلمان تعلیم کے لحاظ سے بہت پسماندہ تھے۔ جب کوئی نوجوان کوئی ڈگری حاصل کر لیتا

---

٥ چیئرمین، آل پارٹیز حریت کانفرنس، جموں و کشمیر

تھا' تو امیدواروں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہونے کی وجہ سے سرکاری ملازمت مل جانا کوئی مشکل مرحلہ نہیں تھا۔ چنانچہ ان کو سب سے پہلے محکمہ سیروسیاحت میں اچھی ملازمت کی پیش کش ہوئی۔ مگر شرط یہ تھی کہ وہ ہیٹ اور نیکر پہنا جائے جو انگریزوں کا خاص اور پسندیدہ لباس تھا۔ محکمہ سیروسیاحت کے ملازمین کے لیے اس کی پابندی ضروری تھی۔ مرحوم نے مجھ سے خود ایک بار اس کا تذکرہ کیا کہ انھوں نے اس شرط کو قبول نہیں کیا اور اس طرح وہ اس محکمے میں ملازم نہ ہو سکے۔ بعد میں ان کو محکمہ تعلیم میں بحیثیت استاد ملازمت مل گئی۔

سری نگر میں تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ وہ مطالعے کے ساتھ بھی خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ سری نگر کے مہاراج گنج بازار میں غلام محمد نور محمد تاجران کتب کی ایک مشہور و معروف دکان تھی۔ مرحوم اس دکان پر کتابوں کے مطالعے کی غرض سے آتے رہتے تھے۔ ان کتب فروش برادران کے ہاتھوں رسالہ ترجمان القرآن کی ایک کاپی انھیں میسر آگئی جو لاہور سے مرحوم مولانا مودودیؒ کی ادارت میں نکلا کرتا تھا۔ ترجمان القرآن کے مضامین پڑھ کر مرحوم کو ایسا لگا کہ جیسے ان کے دل کی بات کہی جا رہی ہو' ان کی سوچ اور فکر کو کسی نے زبان اور گویائی بخش دی ہو اور کسی نے ان کے دل اور ذہن میں دبے جذبات اور احساسات کو مرئی روپ دے دیا ہو۔ وہ ترجمان القرآن کے مستقل خریدار بن گئے اور مفکر اسلام علامہ مودودیؒ کے ساتھ انھوں نے خط و کتابت کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔

استاد کی حیثیت سے ان کا تبادلہ وادی کے ایک دور افتادہ اور ٹھنڈی فضاؤں کے قصبے شوپیاں میں ہو گیا۔ یہاں ان کی ملاقات ترجمان القرآن کے ایک قاری مولانا غلام احمد احرار صاحب کے ساتھ ہوئی۔ مولانا احرار ابھی بقید حیات ہیں۔ انھوں نے اس ملاقات کا تذکرہ کئی بار کیا ہے۔ شوپیاں کے نیشنل ہائی اسکول میں یہ ایک ساتھ کام کر رہے تھے۔ مرحوم سعدالدینؒ نے شوپیاں میں دوست احباب کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اپنے ایک ساتھی عبدالحق برق کی معیت میں جو ڈرائنگ ماسٹر کی حیثیت سے ان کے ساتھ کام کر رہے تھے' انھوں نے مولانا احرار صاحب کے دولت کدہ پر جا کر ملاقات کی۔ ایک گھنٹے کی گفتگو اور بات چیت کے بعد جب ان کو معلوم ہو گیا کہ مولانا احرار صاحب بھی ترجمان القرآن پڑھتے ہیں تو وہ بے تاب اور مضطرب ہو کر کھڑے ہو گئے اور مولانا احرار صاحب سے گلے ملے۔ گویا ایک گھنٹے کی بالمشافہ ملاقات میں وہ ایک عام کشمیری سے بات کر رہے تھے لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ ترجمان القرآن کے واسطے سے وہ نظریاتی ہم آہنگی کے رشتے میں بھی پیوست ہیں تو انھوں نے گلے مل کر اس کا اظہار کیا۔ ظاہر ہے کہ ان کے ساتھی عبدالحق برق کو تعجب ہوا ہو گا اور بقول مولانا احرار صاحب انھوں نے مجلس میں اس کا اظہار بھی کر دیا۔ ترجمان القرآن کے واسطے سے مرحوم سعدالدینؒ جماعت اسلامی کی فکر اور انقلابی سوچ کے قریب

تر ہوتے گئے۔

ان دنوں ترجمان القرآن میں اشارات کے علاوہ "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش" کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ جاری تھا۔ اس وقت متحدہ ہندستان میں انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ایک طرف انڈین نیشنل کانگریس اور دوسری طرف مسلم لیگ جدوجہد کر رہی تھی۔ ہندستان میں بسنے والے کروڑوں مسلمان شش و پنج اور حیص بیص میں تھے کہ جدوجہد آزادی میں کانگریس کے جھنڈے تلے جمع ہوں یا مسلم لیگ کے؟ کیونکہ انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنا تو مشترکہ مقصد تھا مگر انگریزوں کے چلے جانے کے بعد مسلمان کس قسم کی آزادی سے ہم کنار ہوں گے، یہ بات کھل کر سامنے نہیں آ رہی تھی۔ ہندستان میں مسلمان تقسیم ہو رہے تھے۔ کانگریس کے کیمپ میں عام مسلمانوں کے علاوہ جید علماے دین اور مقتدر شخصیتیں بھی شامل تھیں اور ان کی شرکت کی وجہ سے کم پڑھے لکھے اور سیاسی سدھ بدھ سے عاری مسلمان فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ کدھر جائیں؟ کانگریس نے وطنیت کی بنیاد پر متحدہ قومیت کا نعرہ دیا تھا اور مسلمان علما کانگریس کے اس نظریے کی حمایت میں دلائل فراہم کر رہے تھے۔ چنانچہ اسی دور میں علامہ اقبالؒ کو کہنا پڑا:-

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بو العجبی است

دوسری طرف مسلم لیگ متحدہ قومیت کے مقابلے میں دو "قومی نظریہ" کا اصول پیش کر رہی تھی مگر اس کے پاس اس نظریے کی تشریح، توضیح اور علمی دلائل کا مواد نہیں تھا۔ ان حالات میں مولانا مودودیؒ نے تحریک آزادی ہند اور مسلمانوں کی سیاسی کش مکش اور مسلم قومیت لکھ کر متحدہ ہندستان کے مسلمانوں کے لیے گویا ایک گہری دھند سے ایک روشن اور کھلی فضا میں سفر کرنے کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ سعدالدینؒ اسی فکر سے روز بروز قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ انھوں نے مولانا احرار صاحب کے ساتھ قریبی رابطہ رکھا اور جموں و کشمیر میں جماعت اسلامی کا نظم قائم کرنے کے بارے میں بھی مشورے ہوتے رہے۔

اس دوران میں سعدالدینؒ بارہ مولا تبدیل کر دیے گئے۔ جہاں ان ایام میں اسکول کے بچوں کو ڈوگرہ شاہی خاندان کے تئیں وفاداریوں کا مظاہرہ کرنا پڑتا تھا۔ جھنڈے کو سلامی دینا پڑتی تھی اور جھکنا پڑتا تھا۔ سعدالدینؒ کو یہ حرکتیں اسلام کے مزاج اور روح کے خلاف نظر آئیں۔ انھوں نے مولانا مودودیؒ سے اس بارے میں استفسار کیا۔ مولانا مرحوم نے ان کو لکھا کہ سلامی دینا اور جھک کر غیر اسلامی نظریے اور نظام کے سامنے سر اطاعت خم کرنا، اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ آپ ایسا نہ کریں اور معاملے کو حکمت سے ٹالنے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد جو بھی نتائج سامنے آجائیں، آپ برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

چنانچہ ان کی انقلابی شخصیت نے اپنے لیے یہی انقلابی راستہ اختیار کرلیا اور سلامی دینے سے کھل کر انکار کر دیا۔ غیراسلامی قوتوں اور طاقتوں نے ہمیشہ اور ہر دور میں انقلابی سوچ کو دبانے اور زیر کرنے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کیے ہیں اور اپنی طاقت اور اختیارات کا بے جا استعمال کر کے ایسے افراد اور گروہوں کو ظلم و استبداد اور بربریت کا نشانہ بنایا ہے۔ حق و باطل کی یہ ستیزہ کاری ازل تا ابد جاری رہے گی ~

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی!

اس جرات رندانہ کے مظاہرے کو ڈوگرہ شاہی خاندان کے حکمران اور افسران کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ چنانچہ محکمہ تعلیم کے کارپردازوں نے سعدالدین" کو اوڑی کے دور افتادہ مقام چکاری تبدیل کر دیا۔ یہاں بھی آپ ترجمان القرآن کے ساتھ ذہنی طور پر وابستہ اور جڑے رہے اور مولانا مودودی" کے ساتھ سلسلۂ مراسلت بھی جاری رہا۔ اس دوران میں جماعت اسلامی کا کل ہند اجتماع پٹھانکوٹ پنجاب میں منعقد کیے جانے کا اعلان شائع ہوا اور سعدالدین" اجتماع میں شرکت کے لیے رخت سفر باندھتے ہیں۔ براستہ راولپنڈی آپ پٹھانکوٹ پہنچتے ہیں۔ کشمیر سے اس اجتماع میں مولانا غلام احمد احرار، قاری سیف الدین اور سید محمد شفیع کا کہنا ہے کہ وہ بھی اس اولین اجتماع میں شرکت کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ کل ملا کر چار افراد شریک ہوتے ہیں۔ اولین اجتماع، جس ذوق و شوق، دینی اور روحانی جذبات کے تموج کے ساتھ ان حضرات نے دیکھا، سنا اور برتا ہو گا، حیطہ تحریر میں آنے والی باتیں نہیں ہیں۔ اس اجتماع میں شرکت کی لذت اور چاشنی، طمانیت قلب و ذہن کی فراوانی، دم واپسیں تک ان پر چھائی رہی۔ مرحوم اکثر اس کا تذکرہ فرماتے رہتے تھے۔

پٹھان کوٹ کے اجتماع میں شرکت کے بعد جب یہ قافلہ سخت جاں واپس لوٹا تو انھوں نے اپنے یہاں بھی جماعت کا نظم قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ تحریک کے بانی مولانا مودودی" کے ساتھ بھی ان کی ملاقات ہوتی ہے اور وہاں بھی ان کو اس امر کی تلقین کی گئی کہ کشمیر میں جماعت اسلامی کی شاخ قائم کی جائے۔ چنانچہ اولیں اجتماع میں اتفاق رائے کے ساتھ سعدالدین" کو امیر منتخب کر لیا گیا۔ یہ ۱۹۴۶ کا زمانہ تھا جب کہ نصف درجن سے کم افراد نے ان کو اس منصب پر فائز کر دیا لیکن ان کی خداداد صلاحیتیں، انقلابی سوچ، دینی مزاج، تحریک شناسی اور اقامت دین کی راہ میں ان کی سخت کوشی اور سرفروشی نے اس سلسلۃ الذھب کو ۱۹۸۵ تک ایک قلیل وقفے کے استثنی کے ساتھ جاری و ساری رکھا۔ اس طرح لگ بھگ ۴۰ سال کے طویل عرصے تک اس مرد حق آگاہ نے جموں و کشمیر کی حدود میں اقامت دین کی جدوجہد میں ایسا نکھار اور ابھار پیدا کیا کہ چار افراد کے مختصر قافلے کا نصب کردہ شجر طیبہ، اللہ غالب و قاہر کے فضل و احسان سے آج ایسا تناور درخت بن چکا ہے جس کے سائے تلے لاکھوں افراد اپنے دین و ایمان کی اقدار کی

پرورش اور نشوونما کا سماں پا رہے ہیں۔ افراد کی کمیوں' کوتاہیوں' کمزوریوں اور خامیوں سے انکار کی جرات نہیں اور نہ کسی انسانی کام کے بارے میں ایسا سوچنا ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن سعدالدین" کے مقدس ہاتھوں سے اقامت دین کا نصب کردہ پودا آج سرزمین کشمیر میں چنار کا درخت بن چکا ہے۔ اس کا اقرار جماعت سے وابستہ افراد کے علاوہ یہاں کا عام مسلمان بھی کر رہا ہے۔

سعدالدین" کی انقلابی سوچ اور کردار کے مظاہر ان کی پوری زندگی پر چھائے ہوئے ہیں۔ اقامت دین کا نصب العین اپنی زندگی کا مقصد اور منشا بنانے کے بعد انھوں نے سب سے پہلے اپنے خاندان کی مروجہ روش سے ہٹ کر خالص دینی اور انقلابی طرز کی زندگی اختیار کر لی۔ چنانچہ اس کی پاداش میں ان کو گھر سے ہجرت کرنا پڑی۔ مجھے ذاتی طور پر ان کی اس مہاجرت کی زندگی کے بہت سے شب و روز اور لیل و نہار دیکھنا پڑے ہیں۔ چونکہ مجھے ۴۹ کے اواخر یا ۵۰ کے اوائل میں ان کے ساتھ تعارف ہوا اور سری نگر میں قیام پذیر ہونے کی نسبت سے میں جماعت اسلامی کے اولیں مرکز شاہ محلہ' نواب بازار کے اجتماعات میں شرکت کی سعادت سے بہرہ ور ہوا کرتا تھا۔ طوالت کے خوف سے نہ تو یہاں اپنے تعارف کی تفصیل بتانے کی گنجایش ہے اور نہ ان واقعات کو دہرانے کی ضرورت۔

ان کی زندگی میں حکمران طبقے کے ساتھ معرکہ آرائی بھی ان کی انقلابی سوچ کی بھرپور نشان دہی کرتی ہے۔ ۱۹۴۷ سے ہی جموں و کشمیر کے متنازعہ خطے کے بدنصیب اور حرماں نصیب عوام کے مصائب و آلام کے دن شروع ہو گئے تھے۔ مرحوم شیخ محمد عبداللہ پہلے ناظم اعلیٰ اور پھر وزیراعظم کے منصب پر فائز ہو چکے تھے۔ ان کا دبدبہ اور سطوت شاہی' ڈوگرہ شاہی خاندان کے رعب و داب سے کچھ کم نہیں تھی بلکہ اگر حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو مرحوم شیخ عبداللہ کا دور اقتدار کئی لحاظ سے ڈوگرہ شاہی جبر و استبداد سے آگے تھا۔ محکمہ تعلیم میں ہیڈ ماسٹروں کا تقرر ہونا تھا۔ مرحوم شیخ محمد عبداللہ نے خود انٹرویو لینا اور انتخاب کرنا پسند کر لیا اور امیدواروں کو اپنے دفتر بلوا لیا۔ پہلے یہ بھاشن دیا کہ ہیڈ ماسٹر کے منصب پر فائز کرنے کے لیے سخت چھان پھٹک کرنا پڑے گی مگر جب انتخاب کا موقع آیا تو بغیر انٹرویو لیے امیدواروں کو قطار میں کھڑا کر دیا اور اپنے قد کی مناسبت سے طویل القامت اساتذہ کو منتخب ہو جانے کا مژدہ سنایا۔ سعدالدین" کی انقلابی اور دینی بے باکی بھڑک اٹھی۔ انھوں نے شیخ عبداللہ کے رعب و دبدبے کو خاطر میں لائے بغیر انھیں ٹوکا اور کہا کہ آپ نے تو ابھی یہ بھاشن دیا تھا کہ سخت چھان پھٹک ہو گی۔ اس لیے آپ کو چھان پھٹک کرنا ہو گی۔ اس پر شیخ عبداللہ نے پوچھا کہ آپ کا نام؟ جب مرد قلندر نے بے باکی کے ساتھ اپنا نام بتایا تو مرحوم شیخ عبداللہ کو ان کے بارے میں سی آئی ڈی کی دی گئی رپورٹیں ذہن میں تازہ ہو گئیں اور سعدالدین" کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: اچھا! آپ ہی وہ ہیں جو اسلام پھیلاتے اور اسلام کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ شیخ عبداللہ

مرحوم نے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے سعدالدینؒ کو سروس سے معطل کر دیا۔ ان کی معطلی کا یہ دور اس وقت تک جاری رہا جب تک شیخ محمد عبداللہ ۹/اگست ۱۹۵۳ء میں خود معطل ہو گئے اور زینت زنداں بنا دیے گئے۔ فاعتبروا یااولی الابصار!

سعدالدینؒ جب درس قرآن دیتے تھے تو سامعین میں کوئی فرد ایسا نہیں رہتا تھا جس کی آنکھ نم نہ ہو رہی ہو۔ ان کے درس قرآن کی امتیازی خصوصیت یہ ہوا کرتی تھی کہ گردوپیش کے حالات پر قرآنی آیات، احکامات اور ہدایات کا اتنا صحیح اور ٹھیک انطباق ہوتا کہ یوں لگتا تھا کہ یہ آیات ابھی ابھی نازل ہو رہی ہیں اور موجودہ حالات میں ہماری بھرپور اور بروقت رہنمائی ہو رہی ہو۔ قرآن پاک کے ساتھ ان کا شغف اور تعلق اتنا گہرا اور دائمی تھا کہ ان کو کبھی مترجم قرآن پاک کے نسخے سے مدد نہیں لینا پڑتی تھی۔ وہ ہمیشہ معریٰ قرآن پاک سامنے رکھ کر درس دیتے تھے۔ ۴۰ سال کے طویل عرصے میں شاید ہی کوئی موقع ایسا آیا ہو کہ وہ مجلس میں موجود ہوں اور کسی اور نے درس قرآن دیا ہو۔ حالانکہ فضلاے دیوبند اور علما بھی تشریف فرما ہوا کرتے تھے۔

میں نے ذاتی طور ان کی زندگی اور سیرت کی یہ خصوصیت نمایاں طور پر محسوس کی ہے کہ دور سے دیکھ کر ان کی وجاہت اور شخصیت کا رعب طاری ہو جاتا تھا لیکن جب ان کے قریب ہوا جاتا تھا تو وہ بہت ہی نرم، ہنس مکھ، لطیف مزاج اور گداز دل کے مالک معلوم ہوتے تھے۔ وہ نام و نمود اور شہرت سے دور بھاگتے تھے۔ نظریاتی طور پر جو لوگ اسلام کا جامع تصور نہیں رکھتے تھے اور تفریق دین و سیاست کے قائل اور علم بردار ہوا کرتے تھے، ان کے ساتھ وہ بہت ہی کم آمیز تھے۔ ۱۹۶۵ تا ۶۶ کے ایام اسیری میں، مجھے اکتوبر ۶۶ سے مارچ ۶۷ تک ان کے ساتھ بہت قربت رہی۔ جماعت اسلامی سے وابستہ جملہ افراد کو اکتوبر میں ہی رہا کر دیا گیا اور ہم دونوں کو جیل میں ہی رہنے دیا گیا تھا۔ اس عرصے میں مرحوم مولانا محمد سعید مسعودی اور ان کے ساتھی بھی جیل میں تھے۔ ہم لوگ ایک ساتھ نمازیں ادا کرتے تھے۔ رمضان المبارک کا مہینہ آیا تو مرحوم سعدالدینؒ سے نماز تراویح میں قرآن سنانے کی استدعا کی گئی۔ مرحوم سعدالدینؒ نے بڑی خندہ جبینی کے ساتھ درخواست قبول کی اور ہم لوگوں کو پورے رمضان المبارک میں قرآن پاک سننے کی سعادت نصیب ہوئی۔ عیدالفطر پر مرحوم مولانا مسعودیؒ نے روایتی انداز میں ان کی دستار بندی کرنا چاہی مگر مرحوم سعدالدینؒ نے اتنی سختی سے اور درشتی کے ساتھ ان کی اس روایتی دستار بندی کو ٹھکرایا کہ مرحوم مسعودیؒ اور ان کے قریبی ساتھی مرحوم غلام محی الدینؒ بے بس ہو کر رہ گئے۔ میں نے اپنے کمرے میں آکر مرحوم سعدالدینؒ سے پوچھا کہ آپ نے تو بہت ضد کی۔ اس پر مرحوم نے شیریں مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ ان روایتوں کو تو ہم نے توڑنا ہے۔ اگر ہم لوگ ہی ان کی پزیرائی کریں تو اصلاح احوال کی کن

سے امیدیں رکھی جائیں گی؟

۱۹۷۵ میں آنجہانی اندرا گاندھی نے بھارت کی حدود میں ایمرجنسی نافذ کر دی۔ لیکن بھارتی مقبوضہ جموں و کشمیر میں اس کا نفاذ نہیں ہو سکتا تھا۔ جماعت اسلامی جموں و کشمیر نے مرحوم شیخ عبداللہ اور مرحوم مرزا محمد افضل بیگ کے خلاف الیکشن لڑا تھا تاکہ اندرا عبداللہ ایکارڈ [اتحاد] کو رد کیے جانے کا ریکارڈ تاریخ کے صفحات پر ثبت ہو جائے۔ مرحوم شیخ محمد عبداللہ اس مخالفت کا زخم لیے سہلا رہے تھے کہ ان کو ایمرجنسی کا ہتھیار ہاتھ لگا۔ انھوں نے خود دعوت دی کہ جموں و کشمیر میں بھی ایمرجنسی نافذ کی جائے۔ اس میں ان کے پیش نظر صرف اور صرف جماعت اسلامی پر پابندی عائد کرنا اور جماعت اسلامی کے زیر اہتمام چلنے والے ۲۰۰ سے زائد تعلیمی اداروں کو جن میں ۲۰ ہزار طلبہ و طالبات زیر تعلیم تھے اور ۶۰۰ اساتذہ اور استانیاں برسر روزگار تھیں، مقفل اور بند کروانا تھا۔ چنانچہ جماعت اسلامی پر پابندی لگا دی گئی اور تمام درس گاہیں بند کر دی گئیں۔ جماعت اسلامی کی قیادت کو پابند سلاسل کر دیا گیا۔ اس مرحلے پر مرحوم سعدالدینؒ کی انقلابی سوچ نے انقلابی رخ اختیار کیا۔ وہ گرفتاری سے بچ کر روپوش ہو گئے۔ انھوں نے جماعت اسلامی کے تمام حلقوں کو زندہ اور متحرک رکھا۔ مرحوم اس عرصے میں وادی کے چپے چپے میں گھومے حتیٰ کہ پہاڑی علاقوں کا سفر کر کے بھی انھوں نے جماعت اسلامی کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ کارکنوں کو حوصلہ دیا، حکومت کی لگائی ہوئی پابندی کو روند ڈالا، اور اقامت دین کا نصب العین دار و گیر کے اس فسطائی دور میں بھی زندہ و تابندہ رکھا۔ جماعت اسلامی کے حلقوں میں چونکہ یہ ایک نئی طرح تھی اس لیے کہیں کہیں اس پر گفتگو بھی ہوئی۔ مگر اس کے اثرات اور نتائج کو جب دیکھا گیا تو سب نے محسوس کیا کہ اس مرحلے پر جماعت کے حلقہ اثر کو زندہ اور متحرک رکھنے کے لیے ایسا کرنا ایک مدبرانہ اور انقلابی اقدام تھا جس کو سعدالدینؒ جیسے انقلابی سوچ کے لیڈر اور رہنما ہی اختیار کر سکتے تھے۔

۱۹۸۵ میں جماعت اسلامی جموں و کشمیر کے دستور میں ترمیم کر کے عام ارکان سے امیر اور شوریٰ کے براہ راست انتخاب کا اختیار لے کر نمایندگان کے حوالے کر دیا گیا۔ مرحوم سعدالدینؒ اس ترمیم کے زبردست مخالف تھے۔ ہم لوگ ان ایام میں سری نگر سنٹرل جیل میں تھے۔ ہم سے بھی ترمیم کے علم برداروں نے پوچھا مگر اس مرحلے پر اس ترمیم کے نتائج اور عواقب کا ہم اندازہ نہ کر سکے اور ہم نے بھی سادگی کے ساتھ صاد کر دیا۔ مگر اس وقت سے آج تک جماعت اسلامی جموں و کشمیر کے انتخابات میں وہ روح برقرار نہ رہ سکی جو ۱۹۸۵ تک کے انتخابات میں غالب و کارفرما رہا کرتی تھی۔ ارکان نمایندگان کے انتخاب کے بعد لاتعلقی محسوس کر رہے ہیں۔ مرحوم سعدالدینؒ کی نگاہ دور رس ان سارے نتائج و عواقب سے بروقت آگاہ تھی۔

۱۹۶۹ میں جماعت اسلامی نے پنچایتی انتخابات میں حصہ لیا۔ ۱۹۷۱ میں وسط مدتی پارلیمانی انتخابات میں شرکت کی، ۱۹۷۲ میں جموں و کشمیر کے اسمبلی انتخابات میں حصہ لیا۔ اجتماع ارکان نواب بازار، سری نگر کے مرکزی دفتر میں مرحوم سعدالدینؒ نے جس انداز سے انتخابات میں شرکت کی وکالت کی، اس نے بھاری اکثریت کو مطمئن کر دیا۔ چند ایک کے سوا سب نے شرکت کے حق میں ووٹ دیا۔ جماعت اسلامی پاکستان کے ماچھی گوٹھ اجتماع کے شرکا کو ہمارے یہاں کے مناظر کا ٹھیک ٹھیک احساس ہو گا۔ یہ بہت بڑا انقلابی قدم تھا اور میں پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہوں گا کہ یہ صرف اور صرف مرحوم سعدالدینؒ کی انقلابی سوچ کا نتیجہ تھا ورنہ ہم جیسے لوگ شاید ہی ایسا انقلابی قدم اٹھا سکتے تھے۔ انتخابات میں شرکت کو جموں و کشمیر کی حدود میں جماعت اسلامی کی ایک غلطی تصور کیا جا رہا ہے مگر میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اس انقلابی اقدام نے جماعت اسلامی کے نصب العین کو عام لوگوں تک پہنچانے میں جو مدد اور مواقع فراہم کیے وہ شاید صدیوں تک فراہم نہ ہو پاتے۔ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ کمزوریاں انسانی کاموں کے ساتھ جسم اور روح کی طرح ساتھ ساتھ لگی رہتی ہیں مگر موازنہ کر کے جب دیکھا جائے تو اعتراف حقیقت کے اثبات کے لیے جس طرح دلائل کا سہارا لے کر ایوان اسمبلی اور انتخابی مہم کے دوران میں کام ہوا وہ بھی تاریخ کا ایک درخشندہ باب قرار دیا جا سکتا ہے۔

مرحوم سعدالدینؒ ہم سے رخصت ہو گئے۔ وہ اعلاے کلمتہ اللہ، اعمال صالحہ اور اعلان مسلم کے ساتھ اپنے مولاے حقیقی کے دربار میں پہنچ چکے ہیں۔ ۴۰ سال کے طویل عرصے میں ان کے قریب اور ساتھ رہ کر ان کی تربیت اور آغوش عاطفت میں شب و روز گزار کر چند صفحات میں واردات قلب کو حیطۂ تحریر میں لانا ازبس مشکل ہے۔ محض ان کی یاد تازہ کرنے کی خاطر گوناگوں مصروفیات میں سے وقت نکال کر یہ صفحات ترجمان القرآن کے لیے لکھے دیے گئے ہیں۔ رب کائنات سے دعا ہے کہ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب ہو اور ان کی روشن کی ہوئی مشعل کو ہمیں تاباں اور درخشندہ رکھنے کی توفیق نصیب ہو۔ آمین یا رب العالمین!

مظفر بیگ مرحوم

رفیع الدین ہاشمی ٥

آئین کا پہلا شمارہ ۲۱ ستمبر ۱۹۶۴ کو منظرعام پر آیا۔ "آئین جواں مرداں" کے عنوان سے اس کا مختصر سا اداریہ غیر روایتی اور چونکا دینے والا تھا:

یہ آئین ہے۔

اور آئین جواں مرداں' حق گوئی و بے باکی قرار پاتا ہے۔ حق اگر محض ایک اچھال دینے والا نعرہ یا صرف ایک بکھیر دی جانے والی حکایت نہیں ہے تو یقیناً یہ خالق حقیقی کی عطا کردہ بہت بڑی نعمت ہے۔ خدائے بزرگ و برتر جو برحق ہے' اس کا فرمان اپنے ماننے والوں کے لیے حق گوئی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ پھر اگر زندگی بجائے خود ایک سستا کاروبار یا بنیے کی دکان یا زرپرست کی تجوری نہیں ہے تو وہ آخر حق گوئی سے کیوں محروم رہ سکتی ہے۔

یہ ایک اہم سوال ہے--- سوال اٹھانا آسان ہوتا ہے اور مثبت جواب سامنے لانا مشکل اور باعث صد مصائب' لیکن جو چیز زندگی کا نصب العین قرار پائے' اس کی راہ میں مشکلات و مصائب کا کیا تذکرہ۔

یہ خدائے ذوالجلال ہی ہے جو اپنے بندوں کو توفیق عطا فرماتا ہے۔ خدا ہم سب کو حق گوئی' حق شناسی اور حق کو قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مظفر بیگ (وفات: ۲۴ اپریل ۱۹۹۹) وہ جواں مرد تھے' جن کی ۳۵ سالہ "آئینی زندگی" اور اس زندگی کی سب سے بڑی خوبی: حق گوئی و بے باکی اور حق شناسی کی تفصیل ہمیں آئین کے صفحات پر ملتی ہے۔ آئین ہماری صحافت کا ایک انوکھا پرچہ تھا' ایک ایسا پرچہ جس کا آغاز بھی مظفر بیگ نے کیا تھا' اور اس کا آخری شمارہ بھی انھی کے ہاتھوں مرتب ہوا۔ آئین ہی ان کی پہچان تھا۔ مولانا معین الدین خٹک مرحوم جب کبھی لاہور آتے اور بیگ صاحب کا سامنا ہوتا تو فرماتے: "مظفر بیگ صاحب آئین والے"۔ آئین بیگ صاحب

---

٥ استاد شعبہ اردو' پنجاب یونی ورسٹی' اورینٹل کالج' لاہور

کے لیے مشغلہ حیات تھا۔ کم و کیف حیات کا معیار اور پیمانہ ' اور حاصل حیات بھی--- جب آئین اپنا فرض ادا کر چکا' تو انھوں نے آخری شمارہ مرتب کر کے اس کی بساط لپیٹ دی' اور خود بھی سفر آخرت پر روانہ ہو گئے: ع

جس لیے آئے تھے' سو ہم کر چلے

بیگ صاحب ۱۹۳۵ کے لگ بھگ پشاور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم غالباً بی اے تک تھی۔ لکھنے لکھانے کا ذوق اوائل عمر سے تھا۔ ابتدا میں بچوں کے لیے لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۴۸ کے آس پاس صادق قریشی مرحوم کے جاری کردہ ستارہ میں مظفر بیگ صابر کی متعدد کہانیاں چھپیں۔ قریشی صاحب نے نوجوان ادیبوں کی منتخب تحریروں کا مجموعہ غنچہ شائع کیا تو اس میں بھی پہلی تحریر انھی کی تھی۔ اس زمانے میں وہ اپنے آبائی شہر پشاور ہی میں مقیم تھے--- لاہور کب آئے؟ یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

دراصل ان کے ذاتی اور شخصی حالات سے کم لوگ واقف ہیں۔ طبعاً وہ کم گو اور کم آمیز انسان تھے۔ پچھلی صفوں میں رہنے والے (back - benchers)۔ سامنے آنے اور نمایاں ہونے سے گریزاں رہتے۔ آئین نکلا تو صفحہ ۲ پر' بطور مدیر' ان کا نام درج تھا۔ دوسرے شمارے سے نام خفی قلم سے لکھا جانے لگا۔ ساتویں شمارے میں مدیر کا نام صفحہ ۴ پر چلا گیا اور پھر وہاں سے غائب ہو کر پرنٹ لائن کے آخر میں چلا گیا۔ میرا خیال ہے کہ قواعد کی مجبوری نہ ہوتی تو اپنے پرچے میں وہ کہیں بھی اپنا نام درج نہ کرتے۔ بسا اوقات ان کی تحریریں بلانام چھپتیں اور کبھی کسی قلمی نام سے' مثلاً: شہاں یا شاہد وغیرہ۔

وہ عموماً ازخود لوگوں سے ملنے ملانے سے گریز کرتے' ملتے تو اختصار سے صرف کام کی بات کرتے۔ بے مقصد اور غیر متعلق باتوں سے گریزاں' جلسے جلوسوں اور محفلوں سے بالعموم اجتناب۔ ہاں' اگر آئین کے لیے کہیں جانا پڑتا یا کسی سے ملنا ضروری ہوتا' تو ہرگز دریغ نہ کرتے۔ اگر کوئی دفتر آئین میں ان سے ملنے چلا جاتا تو خوش دلی سے پیش آتے اور حسب استطاعت تواضع بھی کرتے۔ نسیم مارکیٹ کی اس چھوٹی سی دکان کے ایک گوشے میں' ان کا مختصر چائے خانہ اول تا آخر موجود رہا۔ دفتر آئین شہر لاہور کے مصروف علاقے (ریلوے روڈ اور گوالمنڈی) میں واقع تھا۔ اس لیے لاہور اور بیرون لاہور سے آنے والے قارئین آئین کے علاوہ' بیگ صاحب کے مداحوں اور بے تکلف دوستوں کا پھیرا ان کے پاس لگا رہتا تھا۔ بعض دوست حالات حاضرہ یا تحریکی مسائل پر ان سے بحث مباحثہ کرنا چاہتے' بیگ صاحب پہلے تو گریز کرتے کیوں کہ اس سے اُن کے کام میں حرج ہوتا تھا' لیکن جب بحث ناگزیر ہوتی تو بیگ صاحب دلائل کے ساتھ اپنا موقف بیان کرتے' اِشکالات کی وضاحت کرتے اور اعتراضات کے جواب دیتے---- استدلال ٹھوس اور لب و لہجہ نرم اور حلیم۔ اگر کوئی تحریکی مسئلہ ہوتا تو محسوس ہوتا' اس سے بہتر اور صحیح جواب کیا ہو سکتا ہے' تحریکی

موقف کے اصل ترجمان تو شاید بیگ صاحب ہی ہیں--- آئین کے اوراق اس کی گواہی دیں گے۔

شخصی سطح پر بات چیت اور ملاقات میں وہ جتنے وضع دار اور شفیق تھے مختلف مسائل پر اصولی موقف پر اتنے ہی بے لچک اور سخت، جیسے اقبال نے انھی کے لیے کہا ہو: ع

رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

پہلی ملاقات میں اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ بہ ظاہر یہ سادہ لوح شخص، بہ باطن ایسا "راسخ العقیدہ" ہے اور اگر اس سے بحث کریں گے تو اس کے مضبوط اور مدلل موقف کے سامنے پسپا ہوتے اور ہتھیار ڈالتے ہی بنے گی۔

راقم کے خیال میں مرحوم کی سب سے بڑی خوبی ان کی "یکسوئی" تھی (اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا، حم السجدہ ۴۱:۳۰۔ جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے)----- مرحوم ایک باکمال اور صاحب اسلوب قلم کار تھے۔ صحافت کی دنیا میں چند برسوں کی آوارہ خرامی کے بعد، انھیں نصب العین کی وہ یکسوئی نصیب ہوئی جسے ہم ان کی شخصیت کی کلید یا وصف امتیازی کہہ سکتے ہیں۔ "حنیف" ہونا، معمولی بات نہیں۔ یہ یکسوئی انھی کو ملتی ہے جو خود کو دین کے لیے خالص کر دیں (مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ، البینہ ۹۸: ۵۔ دین کو اس کے لیے خالص کرنے والے، بالکل یکسو)۔ آئین کے شمارہ اول میں مدیر آئین نے "حق کو قبول کرنے کی توفیق" مانگی تھی، رب ذوالجلال نے ان کی دعا قبول فرمائی اور انھیں وہ کچھ عطا فرمایا جس کے وہ طلب گار تھے----- حق گوئی، بے باکی اور حق شناسی۔ ان جیسے باصلاحیت شخص کے سامنے بہت سے راستے تھے: مال و دولت، عیش و تنعم، شہرت و ناموری، راحت و آسودگی، مگر انھوں نے ہر طرح کی ترغیب و تحریص اور سود و منفعت کو نظرانداز کرتے ہوئے جادۂ حق کو اپنایا۔ آئین کے چند ہی شمارے نکلے تھے کہ اس کے منفرد انداز نے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ جیلانی بی اے مرحوم نے، نئے ذائقے کے اس پرچے کو خوش آمدید کہتے ہوئے لکھا: "اس کساد بازاری اور ناقدری کے زمانے میں، جب کہ ہر شخص معاشی عافیت کا طالب ہے، ایسے لوگ کیسے نکل آئے کہ جنھیں معاشی عافیت سے مطلوب تر کوئی اور چیز ہے؟" (آئین، ۱۴ نومبر ۱۹۶۴، ص ۵)۔ جیلانی صاحب کا تعجب بجا تھا۔ ہماری صحافت میں ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی کہ یکسوئی کے ساتھ کسی نصب العین کے لیے پوری زندگی وقف کر دی جائے۔ درحقیقت یہ بہت بڑی نعمت ہے، جس سے بیگ صاحب سرفراز ہوئے: ع "یہ رتبہ بلند ملا، جس کو مل گیا"۔

ہفت روزہ ایشیا سے مستعفی ہوئے تو جناب فضل الرحمٰن رومی کی تحریک اور تعاون سے، بیگ صاحب کے زیر ادارت آئین نکلنے لگا۔ اس کے مالی حالات اول روز ہی سے غیر تسلی بخش رہے، پرچہ کسی

سرمائے کے بغیر شروع کیا گیا تھا مگر اس کا سب سے بڑا اور اصل سرمایہ اس کے مدیر کی یکسوئی' کارکنان آئین کا عزم اور اس کے قارئین کی نیک تمنائیں تھیں۔ آئین کئی دفعہ مالی بحران کا شکار ہوا' اس کی اشاعت میں تعطل پیدا ہوا' اور اس تعطل میں لمبے وقفے بھی آئے۔ ہفت روزے سے ماہنامہ ہوا اور کبھی سہ ماہی' مگر بیگ صاحب کبھی بددل نہیں ہوئے۔ ان کے عزم بالجزم میں سرمو فرق نہیں آیا۔ جس یکسوئی کے ساتھ انھوں نے اول روز سے آئین کا آغاز کیا تھا' تاآخر وہ اسی لگن کے ساتھ کام میں مصروف رہے۔ اشاعت کے لمبے وقفوں کے درمیان "کام" کیا ہوتا؟---- آئین کے آیندہ پرچوں اور خاص نمبروں کی تیاری۔ اس "کام" کی نوعیت اور تفصیل آئین کی فائلوں میں محفوظ ہے۔ آئین کے لیے موصول ہونے والی تحریروں کی تدوین اور انھیں بنانے سنوارنے پر وہ بہت محنت کرتے تھے۔ ان کی اپنی تحریر بہت جچی تلی' تیکھی اور کاٹ دار ہوتی تھی--- (آئین کے اداریوں کا مجموعہ "حاصل" ان کے جان دار اور موثر اسلوب کا ایک نمونہ ہے)۔ بیگ صاحب نے بعض معرکہ آرا نمبر نکالے۔ انھیں کسی خاص موضوع پر پرانی تحریروں کی مدد سے خاص نمبر تیار کرنے کا خداداد ملکہ حاصل تھا۔ وہ پرانی تحریروں کو اس سلیقے اور خوب صورتی سے ترتیب دیتے کہ ایک تازگی اور ندرت کا احساس ہوتا۔ بے اختیار مدیر آئین کو داد دینے کو جی چاہتا۔

بیگ صاحب کے لیے ساری صلاحیتوں کا ایک ہی مقصد تھا' سارے وقت کا ایک ہی مصرف تھا' اور ساری سرگرمیوں کا ایک ہی ہدف: آئین --- زندگی کی معنویت ان کے لیے آئین میں مرتکز ہو گئی تھی۔ انھوں نے آئین کو جس خلوص و محبت اور بے نفسی و بے غرضی اور والہانہ پن سے چلایا' زندہ رکھا وہ اس دور میں ایک نایاب شے ہے۔ ایسا رویہ صرف اپنی اولاد کے لیے روا رکھا جاتا ہے' شاید کچھ لوگ اولاد کے لیے بھی ایسا ایثار نہیں کر سکتے۔ اب انھوں نے آئین کو بند کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ فیصلہ انھوں نے اپنے اوپر کتنا جبر کر کے کیا ہو گا؟ اس کا اندازہ صاحب اولاد لوگ بہ خوبی کر سکتے ہیں' لیکن بیگ صاحب کے نزدیک شاید اس کے سوا' اب کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا۔

آئین کی محبت میں بیگ صاحب نے ہر طرح کی آزمایش برداشت کی۔ وہ ایک باذوق' سلیقہ شعار اور نفیس الطبع شخص تھے (اس کی ایک جھلک آئین کے اوراق میں ملتی ہے) مگر ان کی افتاد طبع درویشانہ تھی۔ دفتر آئین' ان کی فقر و درویشی کا آئینہ تھا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ' جو مدیر مسئول سے لے کر مدیر انتظامی' کاپی پیسٹر اور ڈسپیچر تک سبھی کا دفتر تھا۔ ایک طرف پرانے اخبارات کے ڈھیر' ضروری ریکارڈ اور دفتر آئین کی لائبریری' دیوار کے ساتھ مدیر کی میز جس کے پہلو میں ضروری کاغذات کے ریک' دوسری سمت انتظامی شعبے کی چھوٹی میز اور ایک گوشے میں چائے خانہ۔ ۳۵ برسوں میں مختلف اصحاب نے مختلف حیثیتوں میں بیگ صاحب کا ساتھ دیا لیکن بارہا ایسا ہوا کہ اداریہ نویسی' مضامین اور خبروں کی تدوین' ۵۔ اے ذیلدار

پارک کی رپورٹنگ' کتابت شدہ لوازمے کی پروف خوانی' کاتب سے رابطہ' کاپی پیسٹنگ ' پرچے کی طباعت' پریس اور جلد ساز کے ہاں آمدورفت' پتوں کی چٹیں' وی پی پیکٹ کی تیاری و ترسیل اور پھر حسابات کا درد سر وغیرہ وغیرہ---- سارے امور مدیر مسئول ہی انجام دیتے: "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ"۔

آئین پر کئی بار کڑا وقت آیا' دوستوں نے انھیں مشورہ دیا کہ کوئی اور مشغلہ اختیار کرلیں: ملازمت' تجارت یا کسی اخبار سے وابستگی (جو ان کے لیے مشکل نہ تھی)۔ جواب میں ایک نگاہ غلط انداز اور سر کی ہلکی سی جنبش' وہ ایسے مشوروں کو مخصوص و معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ہمیشہ رد کر دیتے۔ ان کی پہلی اور آخری محبت تھی: آئین۔ انھوں نے آخر وقت تک اس محبت کو بے لوث اور تازہ رکھا' ان کا انتقال بھی دفتر آئین ہی میں ہوا۔

بیگ صاحب کی اہلیہ ایک ہائی اسکول میں پرنسپل ہیں۔ بیٹی حزیمہ میٹرک کا امتحان دے کر نتیجے کے انتظار میں ہیں۔ اور دو بیٹے: شماس (متعلم ہشتم) اور شناور (متعلم پنجم) قرآن پاک حفظ کر رہے ہیں۔

خدا اُن کی مغفرت کرے--- صحافیوں میں وہ ایمان اور استقامت کی ایک مثال تھے۔ ان کی وفات سے تحریک اسلامی کی صحافت کا ایک عہد ختم ہو گیا۔

اخبار امت

مسلم ممالک ' انتخابات اور جمہوریت

عبدالغفار عزیز ○

پرامن ' آزادانہ ' شفاف انتخابات ' مسلم ممالک کے عوام کے لیے ایسا خواب ہیں جس کی تعبیر تلاش کرتے کرتے یہ صدی اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے۔ معلوم نہیں آنے والی صدی اپنے دامن میں ان کے لیے اس خواب کی کیا تعبیر لیے ہوئے ہے۔

اس صدی میں بیشتر مسلم ممالک نے جدوجہد کر کے استعماری طاقتوں سے آزادی حاصل کی۔ مغرب کو فخر ہے کہ اس نے ان ملکوں کو تہذیب سکھائی اور سیکولرازم اور لبرلزم کے ساتھ ساتھ جمہوریت کا درس دیا۔ اگر آزادی کے بعد ان ملکوں میں حقیقی جمہوری اقدار رائج ہو جاتیں تو ایک فطری عمل کے نتیجے میں یہاں کے عوام کی امنگوں اور آرزوؤں کے مطابق اسلامی نظام کی بنیاد پڑ جاتی' لیکن یہ کیسے گوارا تھا۔ مغرب نے اپنے جن گماشتوں کے سپرد اقتدار کیا' انھوں نے جمہوریت کا راگ تو الاپا لیکن جمہوریت رائج نہ ہونے دی۔ اس میں انھیں اپنے آقاؤں کی مکمل آشیرباد حاصل رہی۔ انتخابات جمہوریت کی اساس ہیں لیکن ان ممالک میں انتخابات کی پہلی casualty بے چاری جمہوریت ہوتی ہے۔ مغرب کے اپنے ممالک میں تو انتخابات کے ذریعے حکمران طے ہوتے ہیں' تبدیل ہوتے ہیں لیکن مسلم ممالک میں انتخابات برسر اقتدار حکمران پر جمہوریت کا ٹھپہ لگانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ جہاں ایسا نہ ہو سکے' پیچھے فوج اپنا کردار ادا کرنے کے لیے موجود ہوتی ہے۔

گذشتہ دنوں کئی ممالک انتخابات کے تجربے سے گزرے۔ نائیجیریا میں طویل فوجی آمریت کے بعد انتخابات ہوئے۔ ترکی میں پارلیمانی و بلدیاتی انتخابات ہوئے۔ الجزائر میں صدارتی انتخابات ہوئے۔ شام میں

○ ناظم' شعبہ امور خارجہ ' جماعت اسلامی پاکستان

صدارتی انتخابات ہوئے۔ مراکش کے سنسنی خیز ضمنی پارلیمانی انتخابات ہوئے۔ ۷ جون کو انڈونیشیا میں پارلیمانی انتخابات منعقد ہو رہے ہیں۔ کویت کی پارلیمنٹ توڑ کر جولائی میں انتخابات کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ آیندہ برس ہونے والے ملائیشیا کے انتخابات کی تیاریاں بھی شروع ہیں۔

مسلم ممالک کے انتخابات بالعموم اس قدر غیر حقیقی اور غیر منصفانہ ہوتے ہیں کہ ان پر سے اعتماد اٹھ چکا ہے۔ یہ انتخابات محض سیاسی ڈراما محسوس ہوتے ہیں۔ اب یہ بھی بھلا انتخابات ہیں کہ ۱۹۹۲ سے جاری خوں ریزی اور آئے دن سیکڑوں افراد کے ذبح کر دیے جانے کے پس منظر میں الجزائر میں سیاسی بحران کے خاتمے کے لیے انتخابات منعقد کیے جاتے ہیں۔ پہلے مختلف حیلے بہانوں سے اسلامی تحریکوں کے نمایندوں کو امیدوار بننے سے روک دیا جاتا ہے اور پھر جب مختلف چھلنیوں سے گزارنے کے بعد میدان میں صرف سات امیدوار رہ جاتے ہیں تو فوج اور انتظامیہ اپنی ساری قوت ایک امیدوار "بوتفلیقہ" پر لگا دیتی ہے۔ اس صورت حال میں چھ کے چھ امیدواروں کے لیے انتخابات کے بائیکاٹ کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہتا۔ میدان میں فوج اور صدر کا چہیتا تنہا امیدوار رہ جاتا ہے، یوں بوتفلیقہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہو جاتے ہیں اور "جمہوریت" کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔

شام کے صدارتی انتخابات میں گذشتہ ۳۰ سال سے حکمران حافظ الاسد ہمیشہ کی طرح اکلوتے امیدوار ہوتے ہیں۔ الی الابد، حافظ الاسد کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے اور جناب صدر 99.9 فی صد ووٹ حاصل کر لیتے ہیں۔ شام کے ہر شہری پر لازم ہے کہ وہ ملازمت، تعلیم اور علاج کی سہولتیں حاصل کرنے کے لیے اپنا انتخابی کارڈ پیش کرے تاکہ ووٹوں کا تناسب زیادہ ہو۔ ہر ووٹر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا ووٹ سیکورٹی فورسز کی موجودگی میں استعمال کرے۔ اب وہ ملک جہاں ابد تک حافظ الاسد ہی بنیادی شعار ہو اور جہاں کم از کم ۱۰ ہزار افراد حافظ الاسد سے اختلاف کی بنیاد پر تہ تیغ کر دیے گئے ہوں وہاں کون مائی کا لال "امن کے محافظوں" کی موجودگی میں حافظ الاسد کو ووٹ نہ دینے کی جسارت کرے گا۔

ترکی بڑی حد تک جمہوری اقدار اور منصفانہ رائے دہی کا اہتمام کرتا ہے لیکن "غیر جانب داری" کا عالم یہ ہے کہ انتخابات سے قبل ترکی کی اصل حکمران "فوج" کھلے لفظوں میں دھمکی دیتی ہے کہ اگر فضیلت پارٹی کامیاب ہوئی تو اسے بھی رفاہ پارٹی ہی کی طرح حکومت نہیں کرنے دی جائے گی۔ صرف دھمکیاں ہی نہیں دی جاتیں بلکہ عملاً سرکار کی طرف سے فضیلت پارٹی کے خلاف دستوری عدالت میں مقدمہ درج کروا دیا جاتا ہے کہ فضیلت پارٹی، رفاہ ہی کا تسلسل ہے۔ اسے غیر قانونی قرار دیا جائے۔ رفاہ کے سربراہ اور سابق وزیراعظم نجم الدین اربکان کو اپنے آٹھ سینئر ساتھیوں سمیت سیاست میں حصہ لینے سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ ترک نوجوانوں کے ہیرو، استنبول کے سابق میئر رجب طیب اردوگان کو انتخابات سے چند روز قبل

جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ بلدیاتی انتخابات' جن میں رفاہ کی یقینی جیت اسے پارلیمانی انتخابات میں کامیاب کروانے کا بنیادی ذریعہ بنتی ہے' اس "احتیاط" کے پیش نظر پارلیمانی انتخابات کے ساتھ ہی یعنی اسی روز منعقد کروائے گئے تاکہ بلدیاتی جیت کا فائدہ قومی انتخابات میں اسے حاصل نہ ہو سکے۔ واضح رہے کہ بلدیاتی انتخابات میں اس دفعہ بھی فضیلت پارٹی ہی پہلے نمبر پر رہی ہے اور اسے ۲۳ فی صد سے زائد ووٹ حاصل ہوئے ہیں۔ ترکی میں ان انتخابی "احتیاطوں" اور دستوری و عسکری دھمکیوں ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے' پارلیمنٹ تشکیل پا جانے کے بعد بھی اس تاثر کو مزید گہرا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے کہ "فوج اور صدر مملکت "فضیلت" کو نہیں چھوڑیں گے"۔ صرف اسکارف اختیار کرنے پر پوری حکومت ایک مسلم خاتون مروہ کاوکجی کے درپے ہو گئی ہے اور اب اس کی شہریت ہی منسوخ کر دی گئی ہے۔

کویتی پارلیمنٹ میں اسلام پسند ارکان اسمبلی اور حکومت کے متعدد وزرا کے درمیان کش مکش اسمبلی کی تحلیل پر منتج ہوئی ہے۔ کویت میں اگرچہ محدود نشستیں اور ووٹروں کی قدرے تھوڑی تعداد ہی انتخابی نظام کا حصہ بنتی ہے لیکن اس میں بھی پیسہ اس قدر بے دردی سے خرچ ہوتا ہے کہ امیدواران ایک ایک کلومیٹر لمبے انتخابی کیمپ قائم کرتے ہیں جن میں پورا عرصہ "پنج تارہ" ہوٹلوں کے تیار کردہ انواع و اقسام کے کھانے اڑائے جاتے ہیں۔ مال دار ہونے کے باوجود اپنا ووٹ بیچ دینے کی بات زبان زدعام ہے اور قبائل کی تقسیم بھی اپنا رنگ دکھاتی ہے۔

ملایشیا جمہوری حوالے سے ایک مثالی ملک قرار دیا جا سکتا تھا لیکن ۲۰ سال حکومت کرنے کے بعد اب مہاتیر محمد کی حکومت نے متوقع وزیراعظم انور ابراہیم کو جس انداز سے سزا دلوائی ہے اس کے نتیجے میں ملایشیا کے عوام کا اپنے ملک کے نظام پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔ آیندہ انتخابات کس حد تک آزادانہ ہوں گے' اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

انڈونیشیا میں انتخابات کی تیاریاں عروج پر ہیں۔ جناب سہارتو ساتویں دفعہ بھی "منتخب" ہو گئے تھے' لیکن طلبہ اور عوام کی تحریک کے نتیجے میں رخصت ہوئے۔ اب ملک میں امن و امان کی صورت حال خراب ہے۔ مسلم عیسائی فسادات کروائے جا رہے ہیں۔ جن طبقات نے ۳۰ سال میں اپنے پنجے گاڑے ہیں' وہ آسانی سے عوام کو حقوق واپس کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ۱۵۰ درخواست دینے والی پارٹیوں میں سے ۴۸ کو انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت دی گئی ہے۔ ۳' ۴ بڑی پارٹیاں ہیں۔ انڈونیشیا سب سے بڑا مسلم ملک ہے جو ایک بڑے تاریخی تجربے سے گزرنے والا ہے۔ اس کے مشاہدے اور مطالعے کی' ہمارے کسی اخبار' ایجنسی یا ادارے نے کوئی فکر کی ہے؟

آج مسلم ممالک کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ یہاں عوام کی آزادانہ مرضی سے حکومتیں قائم ہونے

اور تبدیل ہونے کی روایت پڑے اور مضبوط ہو۔ غلبہ اسلام کے لیے کام کرنے والوں کے لیے بھی راستہ یہی ہے کہ عوام کو یہ حق ملے اور ان کی آزادانہ رائے اسلامی نظام کے حامیوں کے حق میں استعمال ہو۔ جمہوریت اور اسلامی تحریکوں کے حوالے سے مغرب کا ایک اعتراض یہ ہے کہ ان تحریکوں کو ایک دفعہ جمہوری راستے سے حکومت مل گئی تو پھر یہ کبھی اقتدار نہیں چھوڑیں گی حالانکہ دراصل یہ طریقہ تو ان کے نمایندوں کا ہے کہ ۳۰، ۴۰ سال سے ملک کے عوام کو حقوق سے محروم کر کے ظلم و جبر کے ذریعے مسلط ہیں۔ طبعی موت، سازش یا عوامی تحریک کی قربانیوں کے علاوہ ان کو ہٹانے کا کوئی راستہ نہیں۔ جرمنی میں چانسلر تبدیل ہو گیا۔ برطانیہ میں لیبر پارٹی کی حکومت آگئی۔ کلنٹن کو امریکی دستور کے تحت اب جانا ہی جانا ہے۔ بھارت اور اسرائیل کے انتخابات جمہوریت کو قتل کرنے کے لیے نہیں، حکومت منتخب کرنے کے لیے ہو رہے ہیں۔ مسلم ممالک میں ایسا کیوں نہیں ہو سکتا۔

جو مسلم ممالک کا خیر خواہ ہے، یہاں کوئی خوش گوار تبدیلی چاہتا ہے، جہالت، غربت اور بے روزگاری ختم کرنا چاہتا ہے، ترقی چاہتا ہے، اسے چاہیے کہ اپنا پورا وزن ان ممالک میں آزادانہ انتخابات کے پلڑے میں ڈالے۔ مغرب میں بھی جو عناصر مسلمانوں کے دوست ہیں ان کی دوستی کا حق بھی یہی ہے۔ مسلمانوں کی اس سے زیادہ دشمنی کوئی نہیں کہ انھیں اپنے حکمران منتخب کرنے کے آزادانہ حق سے محروم رکھا جائے۔ ان کے معاشروں میں رجوع الی اللہ اور اصلاح کی تحریکیں بھی تب ہی اجتماعی زندگی میں برگ و بار لائیں گی جب یہ حق قائم ہو گا۔

رسائل و مسائل

نماز میں تاخیر اور دفتر یا گھر میں نماز باجماعت

سوال: مجھے ایک پروگرام میں شرکت کا موقع ملا۔ ایک ذمہ دار فرد تقریر کر رہے تھے۔ مغرب کی اذان ہو جانے کے باوجود انھوں نے تقریر جاری رکھی۔ توجہ ولانے کے باوجود آدھے گھنٹے کی تاخیر کے بعد جب اندھیرا چھا چکا تو اذان دلوائی گئی اور جماعت سے نماز ادا کی گئی۔ کیا نماز میں اس قسم کی تاخیر خلاف شرع نہیں؟ کیا یہ نماز قضا ہو گئی؟

یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ مسجد کے بجائے گھر اور دفاتر میں معمولاً نماز باجماعت ادا کی جاتی ہے۔ دفتری کاموں اور کھانے کی وجہ سے بھی نماز کو مؤخر کر دیا جاتا ہے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرما دیجیے۔

جواب: ۱۔ سوائے ان نمازوں کے جن کا اول وقت سے کچھ تاخیر کے ساتھ ادا کرنا مستحب ہے اور حدیث سے ثابت ہے، باقی تمام نمازوں کی ادایگی اول وقت میں مستحب ہے بالخصوص مغرب کی نماز غروب آفتاب کے بعد اول وقت میں پڑھنے کی ترغیب اور فضیلت زیادہ ہے۔ البتہ اذان اور اقامت کے درمیان ۳ سے ۴ منٹ یا کم و بیش کا وقفہ کرنا مغرب کی نماز میں بھی مستحب ہے تاکہ نمازی پہنچ سکیں مگر یہ وقفہ بھی کوئی واجب نہیں ہے۔ جس ذمہ دار شخص نے اذان مغرب کے بعد ۳۰ سے ۳۵ منٹ تقریر کرنے کے بعد اذان دلوا کر جماعت کروائی، انھوں نے اپنے اس عمل کی وجہ سے پورے اجتماع کی نماز مکروہ کر دی تھی۔ اللہ انھیں معاف فرمائے۔ ذمہ دار ہوتے ہوئے بھی انھوں نے بڑی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا۔

موطا امام مالک میں مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے ماتحت امرا اور ذمہ داروں کو لکھا تھا کہ تمھارے فرائض میں میرے نزدیک اہم ترین فریضہ بروقت نماز کا اہتمام کرنا ہے۔ جب اسلامی حکومت کے ذمہ داروں کا یہ فرض ہے تو اسلامی حکومت کے قیام کے لیے جدوجہد کرنے والی جماعت کے ذمہ داروں کا بھی یہی فرض ہونا چاہیے۔ اسلامی جماعت کا نظام اسلامی حکومت کا نمونہ ہونا چاہیے۔ اگر چند منٹ کا فرق ہوتا تو کوئی حرج نہیں تھا۔ لیکن بغیر مرض و سفر کے مغرب کی نماز آدھ گھنٹہ تاخیر سے پڑھنا کراہیت سے خالی نہیں، جب کہ بقول آپ کے نماز کے بعد شرکاے اجتماع کے چلے جانے کا خدشہ بھی نہیں تھا اور اگر

خدشہ تھا تو پھر بھی نماز کو وقت مسنون سے مؤخر کرنے کا عذر شرعی نہیں بن سکتا۔ البتہ آپ کے اس اجتماع کی نماز قضا نہیں ہوئی تھی صرف مکروہ ہوئی تھی۔ اس لیے کہ سورج غروب ہونے کے بعد جب تک مغربی افق پر سرخی باقی ہو اس وقت تک مغرب کا وقت ختم نہیں ہوتا۔ یہ وقت سوا گھنٹہ یا کم و بیش ہوتا ہے۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: "میں نے ارادہ کیا تھا کہ جو لوگ مسجد میں نماز باجماعت پڑھنے نہیں آتے' میں لکڑیاں جمع کروا کر ان کے گھروں کو جلا ڈالوں" (بخاری)۔ (لیکن ان گھروں میں بچے اور عورتیں بھی رہتی ہیں جن پر مسجد میں آکر باجماعت نماز پڑھنا واجب نہیں۔ اس لیے یہ ارادہ ترک کر دیا تھا)۔ اگر گھروں میں باجماعت نماز ادا کرنا کافی ہوتا تو آپ نے یہ وعید کیوں سنائی تھی اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ مسجد میں نہ آنے والے گھروں میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے ہوں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دین کے سنن کی تعلیم دی ہے اور دین کے سنن میں سے ایک یہ ہے کہ نماز اس مسجد میں پڑھی جائے جس میں اذان دی گئی ہو" (مسلم باب فضائل صلوٰۃ الجماعۃ)۔

حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا اجر ۲۵ اور ایک روایت میں ۲۷ درجے زیادہ ہے' تو اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ ہر قدم پر ایک گناہ معاف ہوتا ہے اور ایک نیکی کا اجر ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دفتروں اور گھروں میں جماعت کرانے کی صورت میں قدم رکھنے اور آنے جانے کی ضرورت تو نہیں پڑتی۔ امام بغویؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "جس شخص نے اذان سنی اور جواب نہ دیا تو اس کی نماز نہیں ہوئی الا یہ کہ کوئی عذر ہو" (شرح السنہ للبغوی)۔ حدیث کے سیاق و سباق سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جواب نہ دینے سے مراد یہ ہے کہ مؤذن کی دعوت قبول نہ کی اور مسجد میں آکر نماز باجماعت نہ پڑھی تو اس کی نماز نہیں ہوئی۔ یعنی جماعت کا اجر نہیں ملا۔

اس کے علاوہ مسجدیں بنانا اور ان میں باجماعت نمازیں پڑھنا' اسلام کے شعائر میں سے ہے۔ اگر دفتروں اور گھروں میں جماعت کرانا کافی ہو تو لوگ گھروں اور دفتروں میں اپنے اہل خانہ یا اہل دفتر کے ساتھ نماز باجماعت پڑھیں گے اور مسجدیں بنانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ انھی وجوہات اور اس نوع کے بہت سے دوسرے دلائل کی بنا پر مشہور فقیہ شمس الائمہ حلوانیؒ نے فرمایا ہے کہ گھروں (اور اسی طرح دفتروں میں) بلاعذر باجماعت نماز پڑھنے سے جماعت کا اجر نہیں ملتا (رد المحتار از ابن عابدین شامی' ج ۱' ص ۳۶۸)۔

اگرچہ علامہ شامیؒ نے باب الامامۃ میں فرمایا ہے کہ جماعت کا ثواب تو مل جائے گا مگر مسجد میں پڑھنے

کی فضیلت نہیں مل سکے گی۔ مگر علامہ شامیؒ نے اسی بحث میں لکھا ہے کہ یہ حکم اس شخص کے بارے میں ہے کہ وہ جب مسجد میں آیا تو جماعت ہو گئی تھی۔ اب اگر وہ دوسری مساجد میں جماعت کی تلاش میں نکلتا ہے تو یہ موجب حرج ہو گا۔ اس لیے وہ گھر میں آکر اہل خانہ کے ساتھ باجماعت نماز پڑھ لے۔ اس پر اسے مسجد کی جماعت کا اجر تو نہیں ملے گا لیکن فی الجملہ جماعت کا اجر مل جائے گا۔ باقی رہے وہ لوگ جو بغیر کسی شرعی عذر کے مسجد نہیں جاتے اور دفتروں یا گھروں میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کو عادت بنا لیتے ہیں ان کے بارے میں علامہ حلوانیؒ کی یہ رائے دلائل میں غور کرنے سے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ان کو جماعت کا اجر نہیں ملے گا بلکہ صرف فرض ادا ہو جائے گا۔ صحیح مسلک یہی ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا واجب ہے اگرچہ حنابلہ کے نزدیک فرض عین ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت بڑا نقصان اور خسارہ ہے جس سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس لیے نہیں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ لوگ تو آج کل مسجدوں میں نہ آنے والوں کے نعرے زیادہ لگاتے ہیں بلکہ اس لیے کہ اس عادت کی وجہ سے آخرت کا بڑا نقصان ہو گا۔

رہا یہ سوال کہ وہ کون سے اعذار ہیں جن کی وجہ سے نماز باجماعت ترک کرنے کی رخصت دی گئی ہے، تو ان اعذار میں سے بڑے بڑے اعذار یہ ہیں:

ایسی بیماری جس کی وجہ سے مسجد آنا جانا بہت زیادہ تکلیف دہ ہو اور مرض میں اضافے کا سبب بن سکتا ہو۔ جان، مال یا اہل خانہ کو ضرر پہنچنے کا خوف، خواہ یہ خوف غنڈوں اور دہشت گردوں سے ہو یا درندوں سے، جب کہ مسجد اور گھر کے درمیان جنگل حائل ہو۔ شدید بارش، شدید ترین اور ناقابل برداشت سردی یا گرمی، شدید ترین اور طوفانی آندھی اور راستے کا ایسا کیچڑ جس سے اپنے جسم اور کپڑوں کو بچانا مشکل ہو (رد المحتار از شامی، ج ۱، ص ۴۱۰۔ الموسوعۃ الفقہیہ الکویتیہ، ج ۲۷، ص ۱۸۶ - ۱۸۸)۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دعوت دین اور اقامت دین کی جدوجہد دعاۃ الاسلام کے طریقے کے مطابق اخلاص کے ساتھ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور استقامت و عزیمت کا عزم مرحمت فرمائے۔ آمین! (مولانا گوہر رحمٰن)۔

لڑکی کی رضامندی

س: میری ایک ماموں زاد بہن نے ۵ سال قبل، اپنے بھائی کے ذریعے زید سے رشتۂ ازدواج کی خواہش ظاہر کی تھی۔ زید نے اثبات میں جواب دیا۔ اس دوران دونوں کے درمیان راز داری سے خط کتابت ہوتی رہی۔ اب زید نے اپنے والد کو لڑکی کے والد کے پاس بھیجا جنھوں نے

انھیں پوری صورت حال سے آگاہ کیا۔ لیکن میرے ماموں نے ساری بات سمجھنے اور جاننے کے باوجود رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ ادھر لڑکی اپنے بڑے بھائی کے ذریعے واضح کر چکی ہے کہ وہ زید کی جدائی برداشت نہ کر سکے گی۔ لڑکے کا بھی کہنا ہے کہ اسے جو خصوصیات اپنی ہم سفر میں چاہییں' وہ کسی دوسری لڑکی میں نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اس نوعیت کی محبت نہیں جیسی آج کل معاشرے میں جانی پہچانی جاتی ہے۔ ہمارے گھرانے دینی ہیں۔ لڑکی اور لڑکا دونوں پابند صوم و صلوٰۃ ہیں۔ دونوں کا کہنا ہے کہ ہم کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں گے جس سے دونوں خاندانوں کی بدنامی ہو۔ یقیناً خط کتابت ان کی غلطی ہے' لیکن کیا رشتہ نہ دینا درست رویہ ہے؟ کتاب و سنت سے لڑکی کے والدین کے لیے کیا رہنمائی ملتی ہے؟

ج : رشتوں کے سلسلے میں شریعت نے جو ضابطے طے کیے ہیں اگر لوگ ان کی پابندی کریں تو وہ مشکلات سے دوچار نہ ہوں۔ شریعت نے نکاح کے معاملے میں والد یا ولی کے حق کو بھی ملحوظ رکھا ہے' کہ نکاح کا معاملہ اس سے طے کیا جائے۔ نکاح کا خواہش مند' لڑکی سے براہ راست معاملہ طے کرنے کے بجائے لڑکی کے والد یا ولی سے معاملہ طے کرے۔ پھر نکاح کے لیے والد ایک مجلس نکاح منعقد کرے اور اس میں نکاح کیا جائے۔ رہی یہ بات کہ نکاح کس سے کیا جائے' اگر اس معاملے میں لڑکی اور والد کے انتخاب میں اختلاف پیدا ہو جائے تو شریعت نے لڑکی کے حق کو فائق رکھا ہے۔ نکاح اسی جگہ کیا جائے گا جہاں لڑکی چاہتی ہو اور والد کو برادری یا پنچائیت یا عدالت مجبور کرے گی کہ وہ لڑکی کی خواہش کے مطابق اس کا نکاح کرے۔ اس میں صرف ایک شرط ہے وہ یہ کہ لڑکی ایسے لڑکے سے شادی کا مطالبہ نہ کرے جو اس سے خاندانی' دینی اور پیشے کے لحاظ سے کمتر حیثیت کا مالک ہو۔

آپ نے اپنی ماموں زاد بہن کا جو قصہ نقل کیا ہے اس میں ان سے ایسی غلطی نہیں ہوئی جس کی سزا انھیں اس شکل میں دی جائے کہ ان کا آپس میں نکاح نہ کیا جائے۔ والد کو شرعاً اس بات کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ لڑکی کی جائز خواہش کو نظرانداز کر کے دوسری جگہ اس کا نکاح کرے۔ اس قسم کے جبر کی اسلام میں کوئی گنجایش نہیں ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ثیب (جس کی ایک مرتبہ شادی ہو چکی ہو اس کے بعد وہ مطلقہ یا بیوہ ہو چکی ہو) اپنے نفس کی زیادہ حق دار ہے اپنے ولی کے مقابلے میں۔ اور باکرہ سے اس کے نکاح کے بارے میں اذن لیا جائے گا اور اس کا اذن اس کی خاموشی ہے" (مسلم' ترمذی' ابوداود' سنن نسائی' ابن ماجہ)۔

حضرت خنساؓ بنت خدام انصاریہ سے روایت ہے کہ ان کے والد نے ان کا نکاح کر دیا تھا درآں حالیکہ

کہ وہ ثیبہ تھیں۔ انھوں نے اس نکاح کو ناپسند کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپؐ نے اس نکاح کو رد کر دیا (اس کو صحاح ستہ نے نقل کیا ہے سوائے مسلم کے)۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ کیا عورتوں سے ان کے نکاح کے بارے امر طلب کیا جائے گا؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ میں نے عرض کیا کہ باکرہ سے امر لیا جائے اور وہ شرم کی وجہ سے خاموش رہے تو پھر کیا ہو گا؟ آپؐ نے فرمایا: اس کی خاموشی اس کا اذن ہے۔ اور ایک روایت میں ہے، فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: باکرہ سے اذن لیا جائے گا۔ میں نے عرض کیا کہ باکرہ شرماتی ہے۔ اس سے کیسے اذن لیا جائے گا؟ آپؐ نے فرمایا: اس کی خاموشی اس کا اذن ہے (متفق علیہ)۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک باکرہ لڑکی رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور ذکر کیا کہ اس کے والد نے اس کا نکاح کر دیا ہے۔ در آں حالیکہ وہ اس نکاح کو ناپسند کرتی تھی تو آپؐ نے اس کو اختیار دے دیا (اس کو مسند احمد، ابوداود، ابن ماجہ اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ یہ تمام روایات نیل الاوطار باب ماجاء فی الاجبار والاستمنار ج ۶ سے نقل کی گئی ہیں)۔ ان روایات اور اس طرح کی دوسری روایات کو نقل کرنے کے بعد علامہ شوکانیؒ لکھتے ہیں: ان احادیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ باکرہ بالغہ کا نکاح جب اس کی اجازت کے بغیر ہو گا تو نکاح صحیح نہ ہو گا۔ یہ اوزاعی، سفیان ثوری، اہل بیت اور حنیفہ کا مسلک ہے اور ترمذی نے اسے اکثر اہل علم کا مسلک قرار دیا ہے (ص ۲۵۵)۔

ترمذی میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ولی کی اجازت بھی ضروری ہے لیکن اختلاف کی صورت میں عدالت فیصلہ کرے گی (فان اشتجروا فالسلطان ولی من لاولی له باب ماجاء لا نکاح الابولی ، ج ۱، ص ۲۰۸، طبع کراچی)۔ اگر ولی اور لڑکی میں اختلاف ہو جائے تو پھر سلطان یعنی عدالت ولی ہو گی، اس کا جس کا کوئی ولی نہیں۔

ان سطور سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کے ماموں کو اپنی بیٹی کے معاملے میں وہی فیصلہ کرنا چاہیے جو وہ چاہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو راہ راست اختیار کرنے کی توفیق سے نوازے۔ آمین! (مولانا عبدالمالک)۔

(قارئین کے ارسال کردہ ہر سوال کا جواب شائع کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اشاعت میں کئی ماہ بھی لگ جاتے ہیں۔ لیکن سائل کو جواب ارسال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس لیے گذارش ہے کہ نام اور مکمل پتے کے بغیر کوئی سوال ارسال نہ کیا جائے)۔

کشمیر کے وفا شعار آپ کی توجہ چاہتے ہیں

کشمیر کے شہیدوں، مجاہدوں، زخمیوں اور اسیروں کی بے یارومددگار مائیں، بہنیں، بچے اور وفا شعار مجاہد جو بھوک، بیماری، برف اور بارود کی بارش میں قابض بھارتی فوج سے لڑ رہے ہیں

وہ جو تکمیل پاکستان کے لیے اپنی جانیں لٹا رہے ہیں
ان کے اجڑے گھروں کو بھی یاد رکھیں

کشمیر .... جہاں

۶۱۱۹۰ بچے، بوڑھے، خواتین اور جوان شہید ہوئے۔ ۸۶۳۲۷ زخمی ہوئے۔ ۵۶۶۱ ۷ عقوبت خانوں میں بند ہیں۔ ۶۵۷۵ نوجوان معذور ہیں۔ ۴۲۱۰۰ افراد ہجرت پر مجبور ہوئے۔ ۳۸۱۵۳ گھر اور اسکول جلا دیئے گئے۔ اور کنٹرول لائن پر حالیہ بھارتی گولہ باری سے ہزاروں خاندان بے گھر ہوئے۔

ان کے لیے اپنے نقد

عطیات **صدقات** **زکوٰۃ**

الگ الگ

چیک / ڈرافٹ بنام جناب عبدالرشید ترابی اکاؤنٹ نمبر 1797 بنوا کر درج ذیل پتہ پر ارسال کریں۔
اور اجناس (گرم کپڑے، کمبل، بستر اور راشن) جماعت اسلامی کے قریبی دفاتر میں جمع کرائیں یا براہ راست ذیل پتہ پر بھجوائیں

عبدالحلیم خان (مرکزی ناظم مالیات) جماعت اسلامی، آزاد جموں وکشمیر

415- پونچھ ہاؤس، صدر، راولپنڈی
فون : 051 - 511417
فیکس : 051 - 510197

یا

عید گاہ روڈ، مظفر آباد، آزاد جموں وکشمیر
فون : 0581 - 2334 , 4336 , 5482
فیکس : 0581 - 2580

کتاب نما

قرآن کریم میں نظم و مناسبت ' ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی۔ ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز' علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی' علی گڑھ۔ ملنے کا پتا: علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی' علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲۔ صفحات: ۳۶۸۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔

قرآن حکیم پر بعض مستشرقین کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اس میں نظم و ترتیب کا فقدان ہے' مثلاً ولیم میور نے لکھا ہے کہ اس میں حد درجہ بے نظمی اور بے ترتیبی پائی جاتی ہے' مضامین ایک دوسرے کے ساتھ گڈ مڈ ہیں اور اس میں نہ ترتیب زمانی ہے اور نہ معنوی' آیت کا جو ٹکڑا مدینے میں نازل ہوا' وہ مکی ٹکڑے سے پہلے آگیا ہے چنانچہ ہمارے لیے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ اس وقت قرآن جس شکل میں ہے' عہد نبویؐ میں بھی وہ اسی نظم و ترتیب سے تھا (لائف آف محمد '۱/ ۷)۔

زیر نظر کتاب ابتدائی چھے صدیوں میں قرآنی نظم کے ادبی مطالعات اور نظریات پر مبنی ہے۔ کتاب کا ضمنی عنوان ہے: ''دور اول کے علماے ادب و بلاغت کے افکار کا مطالعہ''۔ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے:

اول: نظم قرآن کی ابتدائی تاریخ۔ مصنف بتاتے ہیں کہ نظم اور مناسبت اس علم کی اہم اصطلاحات ہیں۔ اس بحث میں فاضل مصنف نے علما و مفسرین کے دونوں مکاتب فکر (نظم کے قائل اور نہ ماننے والے) کا غیرجانب داری اور عمدگی سے تجزیہ کیا ہے۔

دوم: نظم قرآنی کے ادبی مطالعات۔ فاضل مصنف کے خیال میں دور اول میں قرآن کا اعجاز اس کے دروبست' فواصل و قوافی کے نظام' استعارات و تشبیہات کے استعمال اور کنایاتی طرز تحریر میں زیادہ نمایاں کیا گیا (ص ۶۱)۔ مصنف نے متعدد علماے ادب و بلاغت کو بحث کا موضوع بنایا ہے۔ ان میں سے بعض عقائد کے لحاظ سے معتزلہ اور اشاعرہ بھی ہیں مگر انھوں نے قرآن حکیم کے ادبی اعجاز اور نظم و مناسبت کے معجزانہ اسلوب پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔

سوم: نظم قرآن کے پہلے مصنف عبدالقاہر جرجانی کے حالات و خدمات کا ذکر' پھر جرجانی پر چند جدید مطالعات کا جائزہ۔ ڈاکٹر فلاحی کے مطابق جرجانی بڑے زور و قوت سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ قرآن اپنی بلاغت و فصاحت کی وجہ سے دائمی معجزہ ہے۔ ان کے خیال میں ہر نبی کو ایسا معجزہ دیا گیا ہے جس کے ذریعے

وہ اپنی نبوت کو ثابت کرتا رہا ہے۔ نبی اکرمؐ کا معجزہ قرآن ہے۔ فاضل مصنف نے جرجانی کا مطالعہ متعدد پہلوؤں سے کیا ہے۔ ان میں بلاغت اور نظم' فکر الفاظ و معانی اور نظم' علم نحو اور نظم' علم معانی اور نظم' علم بیان اور نظم اور علم بدیع اور نظم شامل ہیں۔ اس باب کی دوسری فصل میں ڈاکٹر فلاحی نے بتایا ہے کہ دور جدید میں مشرق و مغرب میں ہر جگہ جرجانی مکتب فکر پر تحقیقات ہو رہی ہیں۔ اس حصے میں مصنف نے ادب و بلاغت اور کلام کی بعض ایسی بحثوں کو بھی چھیڑا ہے جن سے قاری ان افکار و نظریات کے بہاؤ میں گم ہونے لگتا ہے اور موضوع کتاب اوجھل ہونے لگتا ہے۔

باب چہارم: علامہ زمخشری اور نظم قرآن۔ فاضل مصنف کے خیال میں علامہ زمخشری کی تفسیر الکشاف ' قرآن حکیم کی ادبی و بلاغتی تفسیر ہے۔ زمخشری کے نزدیک قرآن حکیم دو پہلوؤں سے اعجازی صفت کا حامل ہے۔ ایک تو اپنے نادر الوجود نظم و ترتیب کی وجہ سے اور دوسرے غیب کی پیش گوئیوں کی وجہ سے (ص ۲۰۴)۔ فاضل مصنف نے تفسیر الکشاف کے دیگر پہلوؤں سے بھی تعرض کیا ہے مثلاً: قرآن کا ادبی اسلوب' ربط آیات' نظم قرآن اور اختلاف قرأت اور تحقیق الفاظ وغیرہ۔

کتاب کے مذکورہ مباحث و مندرجات کے مطالعے کے بعد قاری کو تشنگی اور طلب کا مزید احساس ہوتا ہے۔ وہ قدیم علماے ادب اور مفسرین کے ساتھ ساتھ جدید اور عصر حاضر کی تفاسیر میں بھی نظم و مناسبت کی جھلک دیکھنے کا آرزومند ہے۔ ڈاکٹر فلاحی نے دیباچے میں اپنی جس موعودہ تصنیف کا ذکر کیا ہے امید ہے وہ اس تشنگی کو دور کر دے گی۔

آخر میں خلاصہ بحث' منتخب کتابیات اور حواشی و تعلیقات کا اہتمام ہے' مگر قرآنی آیات پر اعراب نہیں' نہ رموز او قاف کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ بعض مقامات پر ناموں میں یکسانیت نہیں مثلاً ابن عربی (ص ۳۰)' ابن العربی (ص ۵۴)۔ کئی جگہ حمید الدین فراہی کو عبدالحمید فراہی لکھا گیا ہے۔ ص ۲۳۲ پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام درج ہو گیا ہے۔ پروف خوانی پر بھی خصوصی توجہ کی ضرورت تھی۔ ان پہلوؤں سے قطع نظر' مجموعی طور پر یہ کتاب قرآنیات کے ایک اعجازی پہلو پر منفرد اور خوب صورت اضافہ ہے (عبداللہ صالح)۔

پاکستانی جامعات میں عربی زبان و ادب اور علوم اسلامیہ میں تحقیق' سفیر اختر۔ ناشر: ندوۃ المعارف' ۱۳ کبیر سٹریٹ' اردو بازار' لاہور۔ صفحات: ۲۳۔ قیمت: ۱۵ روپے کے ڈاک ٹکٹ۔

فاضل مقالہ نگار نے یہ تحریر ایک سیمی نار میں پڑھنے کے لیے لکھی تھی۔ مقالے کا عنوان نفس مضمون کی توضیح کرتا ہے۔ مقالے کے نصف اول میں برعظیم میں انگریزوں کی آمد اور یہاں کی تعلیمی زندگی پر ان

کے اثرات کا ذکر ہے۔ بقیہ نو صفحات میں مولف نے پاکستان کی جامعات میں اسلامیات اور عربی میں تحقیق پر کلام کیا ہے۔ اس میں سے بھی بیش تر حصہ پالیسی بیانات یا اداروں کے قیام کے تذکرے پر محیط ہے۔

یوں تو ہماری جامعات کے بیش تر شعبہ جات تدریسی و تحقیقی انحطاط کا شکار ہیں، لیکن خاص طور پر عربی اور علوم اسلامیہ کی حالت خاصی دگرگوں ہے۔ دینی درس گاہوں میں تقلید و جمود اور فقہی تنگ نظری نے ملی امنگوں اور توقعات کے بار آور ہونے میں رکاوٹ پیدا کی ہے۔ البتہ بین الاقوامی جامعہ اسلامیہ، اسلام آباد اس مایوس کن صورت حال میں نخلستان کا سا منظر پیش کرتی ہے، مگر فاضل مقالہ نگار کے بقول: علوم جدیدہ کو اسلامی بنیادوں پر استوار [کرنے کے لیے] جامعہ کوئی فکری پیش رفت کرنے میں تاحال چنداں کامیاب نہیں۔ سماجی علوم، علوم کی تدریس میں جامعہ کو زیادہ دلچسپی نہیں ہے (ص ۱۶)۔ ہم سمجھتے ہیں، بہت معیاری یا مثالی نہ سہی، مگر دوسری تمام جدید ملکی جامعات کے مقابلے میں اس جامعہ کو ان میدانوں میں بہرحال ایک امتیاز حاصل ہے۔ وژن میں وسعت کے ساتھ انگریزی اور عربی کا ایسا فہم اور اسلامی فکر سے ایسا تعلق دوسری جامعات میں خال خال دکھائی دیتا ہے۔

جامعات کی تحقیقی سرگرمیوں کے ذیل میں انھوں نے بتایا ہے کہ تحقیقی مقالات غور و فکر سے زیادہ جمع آوری کی روایت کے اسیر ہیں۔ مقالات کے موضوعات کا تعلق "حال" سے زیادہ "ماضی" سے ہوتا ہے اور طالب علم عام طور پر قلمی مخطوطات کی ترتیب و تدوین کو ترجیح دیتے ہیں، بہت ہوا تو آیات اور احادیث کی تخریج کر دی، یا پھر شخصیات کے احوال و آثار پر داد تحقیق (ص ۱۸)۔ صورت حال واقعی یہی ہے۔ حال کے بجائے ماضی پر زیادہ لکھا جانا اسی طرح رائج ہے جس طرح زیر نظر مقالے میں ماضی اور اصولی باتوں پر زیادہ کلام کیا گیا ہے اور جامعات کی عملی صورت کا جائزہ فقط چند سطور میں پیش کیا گیا ہے جس سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ باقی جہاں تک احوال و آثار یا قلمی مخطوطات پر کام کا تعلق ہے تو یہ کام بھی دوسرے درجے کا کام نہیں، بشرطیکہ ان کاموں میں معیار کو پیش نظر رکھا جائے جس کی فی الواقع کمی ہے۔

. جامعات کی سطح پر ہر مضمون اور شعبے کے بارے میں الگ الگ اور جامع تجزیاتی مطالعے پیش کرنے کی ضرورت ہے جن میں ان کے تدریسی لوازمے، تکنیک اور تدریسی عملے کی صلاحیت و استعداد کو بھی زیر بحث لایا جائے اور موازنہ کیا جائے۔ نصابات میں تازہ کاری کی روایت کو پرکھا جائے، پھر تحقیقی ذوق اور سرگرمیوں پر ہمہ پہلو کلام کیا جائے کیوں کہ کسی بھی شعبے کی تحقیقی سرگرمیوں کو اس کے تدریسی ماحول سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا (سلیم منصور خالد)۔

•

Pakistan : Chronology 1947-97 (پاکستان : ماہ و سال کے آئینے میں ۹۷-۱۹۴۷)، مرتب:

جاوید اقبال غوری۔ انچارج: بیگم سعیدہ طاہر خیلی۔ ناشر: نظامت عمومی برائے فلم و مطبوعات، وفاقی وزارت اطلاعات و فروغ ابلاغیات، زیرو پوائنٹ، اسلام آباد۔ صفحات: ۹۴۲+۳۲ (مجلاتی سائز) مع اشاریہ۔ قیمت: درج نہیں۔

پاکستان کی نصف صدی پر محیط تاریخ کامیابیوں اور ناکامیوں کا ایک ایسا اعمال نامہ ہے، جس میں حکمرانوں کے ساتھ پاکستان کے تمام شہری بھی درجہ بہ درجہ حصے دار ہیں۔ دو سال پہلے منعقدہ، پاکستان کی طلائی تقریبات کا زیادہ تر زور میلوں ٹھیلوں پر رہا۔ اس کے باوجود حکومتی سطح پر معدودے چند اچھے اقدامات بھی ہوئے، ان میں سے ایک زیر تبصرہ کتاب کی تیاری و اشاعت ہے۔

حوالے کی اس کتاب کا بنیادی مصدر روزنامے ہیں، جن سے سال بہ سال، ماہ بہ ماہ اور روز بروز رونما ہونے والے واقعات، حوادث، اعلانات، اقدامات، وفیات اور معاہدات کو مختصر الفاظ میں ریکارڈ کر دیا گیا ہے۔ بہت سے اہم وقوعات و اقدامات جو ہمارے پالیسی سازوں، تحقیق کاروں اور سیاسی قائدین کی نظروں سے محو ہو چکے ہیں، زیر نظر کتاب کی مدد سے ذہنوں میں تازہ کیے جا سکتے ہیں۔

یہ ہزاروں واقعات کی قاموس ہے، یہاں چند ایک کا حوالہ پیش کیا جاتا ہے۔ ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء: علامہ شبیر احمد عثمانی نے کراچی اور مولانا ظفر احمد عثمانی نے ڈھاکہ میں منعقدہ خصوصی تقریبات میں پاکستان کے پرچم لہرائے (ص ۱۹)۔ ۱۲ ستمبر، ۱۹۴۷ء: کانگریس اور حکومت کشمیر کے درمیان خفیہ مذاکرات ہوئے (ص ۲۳)۔ یکم نومبر ۱۹۴۷ء: قائداعظم نے لاہور میں ماؤنٹ بیٹن سے کشمیر کے مسئلے پر مذاکرات کیے (ص ۲۸)۔ ۲۰ نومبر ۱۹۴۷ء: پاکستانی وفد نے اقوام متحدہ میں مسئلہ فلسطین پر بحث کا آغاز کیا (ص ۲۹)۔ ۴ فروری ۱۹۴۹ء: پنجاب یونی ورسٹی میں شعبہ دائرۃ المعارف اسلامیہ قائم کیا گیا (ص ۴۲)۔ ۲۶ فروری ۱۹۴۹ء: پارلیمنٹ نے عصمت فروشی کے خاتمے کا قانون منظور کیا (ص ۴۳)۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۵۰ء: وزیراعظم لیاقت علی خاں نے دستور کے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پیش کی (ص ۵۱)۔ ۲۴ جنوری ۱۹۵۱ء: اسلامی ریاست کے قیام کے لیے مختلف مکاتب فکر کے علما نے بائیس نکات پر مشتمل مشترکہ فارمولا پیش کیا (ص ۵۳)۔ ۳ مارچ ۱۹۵۵ء: سندھ چیف کورٹ نے جاگیرداری نظام کے خاتمے کے لیے حکومتی فیصلے کے خلاف حکم امتناعی جاری کیا (ص ۹۲)۔ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء: مشرقی بنگال کا نام تبدیل کر کے مشرقی پاکستان رکھا گیا (ص ۱۰۱)۔ یکم مارچ ۱۹۵۶ء: حکومت پاکستان نے طاقت ور ایٹمی توانائی کمیشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا (ص ۱۰۵)۔ ۳۰ مارچ ۱۹۷۲ء: خان عبدالولی خان نے لائل پور بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ہمارے نزدیک اب پختونستان کوئی مسئلہ نہیں رہا (ص ۲۷۸)۔ ۸ جون ۱۹۷۲ء: مسٹر بھٹو کی پالیسیوں کے معروف نقاد، جماعت اسلامی کے رہنما اور قومی اسمبلی کے رکن ڈاکٹر نذیر کو ان کے کلینک میں گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ جماعت نے اس قتل کا الزام حکمران پارٹی پر لگایا ہے (ص ۲۸۴)۔ ۲۸/اکتوبر ۱۹۷۲ء: صدر بھٹو نے جنوبی ایشیا کو نیوکلیر فری زون بنانے کی تجویز پیش کی

(ص ۳۹۵)۔

دو تین باتیں توجہ طلب ہیں:

اول : واقعات کو چننے یا چھوڑنے کے لیے صوابدید تو مرتب ہی کی ہوتی ہے، لیکن جان بوجھ کر واقعات کی ٹیلرنگ کرنا نامناسب ہوتا ہے۔ اگرچہ ایسا بہت زیادہ نہیں کیا گیا پھر بھی کہیں کہیں پر ایسا کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر "۱۰ دسمبر ۱۹۷۲ء: لاہور میں طلبہ کی ایک تعداد کو گرفتار کر لیا گیا" (ص ۳۹۶)۔ یہ جملہ ادھورا سچ ہے۔ تمام اخبارات نے ان گرفتاریوں کا محرک یہی لکھا تھا: بنگلہ دیش نامنظور تحریک کے سلسلے میں اسلامی جمعیت طلبہ کے حمایت یافتہ منتخب طلبہ نمایندوں کے کنونشن سے طلبہ کو گرفتار کیا گیا۔ مذکورہ صفحے پر سیاق و سباق سے کٹے ہوئے جملے کو پیش کرنے سے اس قاموس کی روح متاثر ہوتی ہے۔

دوم : چودہ کروڑ باشندگان پاکستان کی سرکاری اور قومی زبان اردو ہے۔ کیا ان کے قیمتی وسائل سے ایسی تمام دستاویزات محض انگریزی ہی میں پیش کرنا ناگزیر ہے؟ حالانکہ انگریزی سے استفادہ کرنے والے تو اقلیت میں ہیں۔ کیا یہ اردو قارئین کی اکثریت کی حق تلفی نہیں کہ ریاست کے تمام وسائل اس چھیتے طبقے کے لیے وقف کر دیے جائیں؟ کارپردازاں ریاست و حکومت کو اس غلامانہ ذہنیت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔ یہ اور اس طرح کی تمام دستاویزات اور قانون سازی سے متعلق تمام وثائق کو بہ یک وقت اردو میں بھی شائع کرنا چاہیے۔ یہ محض ایک خواہش کا اظہار نہیں، بلکہ خود دستور پاکستان کا بھی تقاضا ہے۔

سوم: افراد کے انتقال کی خبر کے ساتھ قوسین میں پیدایش کی تاریخ بھی دی جانی چاہیے تھی۔

چہارم: پہلے دس سال کے واقعات کا اندراج بہت کم ہے، پھر اگلے پندرہ برسوں کا نسبتاً زیادہ اور اس کے بعد کے ۲۵ برس خاصی تفصیل لیے ہوئے ہیں۔ اگر ایک جلد کے بجائے اسے دو حصوں میں تیار اور شائع کیا جاتا تو، پاکستان کے تشکیلی دور کی مفصل تصویر سامنے آ جاتی۔

اس کے باوجود یہ کتاب ایک اہم دستاویز کا درجہ رکھتی ہے (س - م - خ)۔

تحریک علی گڑھ تا قیام پاکستان و قرارداد مقاصد ڈاکٹر ایچ بی خان۔ ناشر: الحمد اکادمی، ۲- سے جے، ۱۸ ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰۔ صفحات: ۳۶۶۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

سرسید احمد خان اور ان کی تحریک علی گڑھ پر گذشتہ صدی میں بیسیوں کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔ زیر نظر کتاب، بانی تحریک کے سوانح اور تحریک کی تاریخ کو باہم آمیز کر دینے کے عزم سے لکھی گئی ہے اور اس کی اشاعت سرسید یونی ورسٹی کراچی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے "جشن سرسید" (۲۱ تا ۲۷ مارچ ۱۹۹۸) کے موقع پر عمل میں آئی تھی۔

کتاب ۱۹ ابواب پر مشتمل ہے جن میں سرسید کے سوانح سے لے کر سید جمال الدین افغانی کے ہاں اسلام ازم' شبلی اور دارالمصنفین' رفقائے سرسید: نواب محسن الملک' نواب وقار الملک کے سوانح' ہندستانی سیاست میں علما کا کردار' مختلف قومی تحریکوں' ریشمی رومال' خدام کعبہ' عدم تعاون' ہجرت اور برعظیم کی مختلف سیاسی جماعتوں کانگرس' مسلم لیگ' احرار' جمعیتہ العلماے ہند وغیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مصنف ایک "ریسرچ اسکالر" ہیں اس لیے کتاب محققانہ طریقے پر مرتب کی گئی ہے۔ ہرباب کے آخر میں متعلقہ حواشی درج ہیں۔ آخر میں کتب اردو' کتب انگریزی' اخبارات و جرائد' ذاتی خطوط' اور رودادوں وغیرہ کی ایک طویل فہرست ہے جن سے مصنف نے تصنیف میں استفادہ کیا ہے۔ حوالہ جات و حواشی اور مطالب و مندرجات سے فاضل مصنف کی اس محنت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے اس کتاب کی تصنیف میں اٹھائی ہے۔ کتاب کے آخر میں درج اشتہارات سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف اس سے پہلے بھی برعظیم کی سیاسی تاریخ پر کتابیں لکھ چکے ہیں۔ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں تحریک آزادی کے بعض ایسے پہلوؤں پر بھی توجہ کی گئی ہے جو بالعموم جدوجہد آزادی کے مورخوں کی نگاہوں سے اوجھل رہ جاتے ہیں۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف' سرسید کے حوالے سے واضح نہیں ہیں کیونکہ انھوں نے ایک طرف تو سرسید کی کاوشوں کو "حقیقت پسندی اور آفاقی و فطری رجحانات سے دور" (ص ۲۴۴) قرار دیا ہے اور دوسری طرف سرسید کا کارنامہ یہ بتایا ہے کہ انھوں نے قوم میں مذہبی جوش اور جذبے کو ابھار کر اسے ایک چٹان کے مانند بنا دیا (ص ۲۴۵)۔ کیا آفاقی و فطری رجحانات سے دور رہ کر بھی مذہب کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں؟ اور کیا سرسید کے مذہبی افکار و نظریات کو قوم میں اس قدر مقبولیت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ ان کی بنا پر چٹان بن گئی؟

اگر فاضل مصنف اشاعت سے قبل مسودے پر بہ غور نظرثانی فرما لیتے تو مناسب ہوتا کیونکہ بعض جملے کمزور رہ گئے ہیں اور بعض مقامات پر مطلب بھی خبط ہو گیا ہے' مثلاً: انھوں نے پریس میں ان کے خلاف اشاعت کے لیے مواد لکھنے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا (ص ۱۰۴) یا بعد المشرقین کا فرق (ص ۱۰۷) یہ لکھنے کے بعد کہ مولانا محمد علی جوہر کو علی گڑھ میں استاد کی حیثیت سے پڑھانے کا موقع نہیں ملا' مصنف نے لکھا ہے: وہ اپنے دل سے مادر درس گاہ کی خدمت اور ناکامی کے احساس کو فراموش نہ کر سکے جو بطور استاد وابستہ ہونے کی بنا پر ان کو محبت تھی (ص ۱۰۵)۔

مصنف نے ثانوی مآخذ فراخ دلی سے استعمال کیے ہیں یہاں تک کہ قرآن مجید (سورۃ احزاب) کا حوالہ بھی موج کوثرؒ کے حوالے سے درج کیا ہے (ص ۱۱۹)۔

کتاب کے نام میں جو تطویل ہے اس نے نام کو غیرمتوازن بنا دیا ہے۔ اس طرح کے پہلوؤں کو دوسری

اشاعت میں بہتر کیا جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر کتاب دلچسپ اور معلومات افزا ہے (ظاہر مبین عاصم)۔

اسلامی کلچر، محمد مارما ڈیوک پکتھال، ترجمہ: پروفیسر محمد ایوب منیر۔ ناشر: مکتبہ تعمیر انسانیت، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۱۶۸۔ قیمت: ۱۰۰ روپے، مجلد۔

پکتھال (۷/ اپریل ۱۸۷۵ء - ۱۹ مئی ۱۹۳۶ء) برطانیہ کے شہری تھے۔ ۲۹ نومبر ۱۹۱۷ء کو اسلام قبول کیا، ۱۹۲۰ء میں وہ ہندستان آئے، ۱۹۳۰ء میں انھوں نے قرآن حکیم کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ زیر تبصرہ کتاب مدراس میں "اسلامی کلچر" پر ان کے خصوصی خطبوں کے اردو ترجمے پر مشتمل ہے۔ اس سے قبل بھی یہ کتاب دو مختلف افراد کی کاوش سے اردو ترجمے کا روپ دھار چکی ہے۔ محمد ایوب منیر ایک مشاق مترجم ہیں، تاہم انھوں نے یہ وضاحت نہیں کی، کہ پہلے ترجموں کی موجودگی میں، وہ کس پہلو سے ترجمے کی کمی محسوس کر رہے تھے جس کے لیے انھوں نے یہ مہم سر کی، یا یہ کہ انھوں نے کس ترجمے سے استفادہ کیا۔

یہ کتاب پڑھ کر مصنف پر رشک آتا ہے کہ ایک غیر اسلامی تہذیب میں پروان چڑھنے کے باوجود انھوں نے نہایت تیزی سے اسلامی تاریخ و تعلیمات پر دسترس حاصل کر لی کہ وہ اسلام پر مغرب کے بے سروپا الزامات و اتہامات کی تردید اور اسلامی فکر کو پیش کرنے کے لیے وقف ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ ذہنی غلامی اور فکری مرعوبیت کے اس مقام پر کھڑا تھا کہ تصور کر کے ہی شرم آتی ہے۔ مصنف نے جو لکھا ہے، اور جس خوب صورتی سے مافی الضمیر کو پیش کیا ہے، اس کا احاطہ کسی تبصرے میں ممکن نہیں، اس روشنی اور لذت کے لیے کتاب کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

عیسائیوں کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف پراپیگنڈے کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا ہے: "عیسائیوں کے خلاف مسلمانوں میں مذہبی دیوانگی اور مخالفت کا جذبہ نہیں پایا جاتا" (ص ۳۱)۔ آج کوسووا اور بوسنیا کے واقعات کو ذہن میں رکھیے اور یہ پڑھیے: "یونان کی ۱۸۲۱ کی بغاوت میں مسلمانوں کو چن چن کر یوں قتل کیا گیا کہ ان کا نام و نشان مٹ گیا، اور مسجدوں کی لفظاً و معناً اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ کیا یہ ایک تاریخی حقیقت نہیں ہے کہ بلقان میں مسلمانوں کی اکثریت کو عام یورپ کی تائید اور حمایت کے ساتھ پوری ہولناکی اور بے دردی سے اقلیت میں تبدیل کر دیا گیا" (ص ۸۲)۔ یونان کی ۱۸۲۱ کی جنگ آزادی میں موریہ کی تین لاکھ مسلم آبادی کے مرد، عورت، بچے اور بوڑھے سبھی شہید کر دیے گئے بلکہ یونان کے شمالی علاقوں میں بھی مسلمانوں کو ملیامیٹ کر دیا گیا لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ یورپین تاریخ میں اس قتل و غارت کا ذکر تک نہیں کیا گیا" (ص ۱۰۳)۔ عیسائی پادریوں نے باقاعدگی اور تسلسل کے ساتھ ان [عیسائیوں] کے مذہبی جنون کو پختہ کیا، [اور] انھیں بتایا کہ مسلمان کا قتل کار ثواب ہے (ص ۱۰۳)۔ ان کے

برعکس "رواداری اسلام کی سب سے بڑی قوت ہے" (ص ۱۰۴)۔

پکتھال جدیدیت زدہ مسلمانوں کے ذہنی افلاس کو مسترد کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "آج ہر مسلمان یہ چاہتا ہے کہ شریعت [اسلامی] اپنی اولین اور خالص شکل میں عصر حاضر کے حالات و مسائل پر منطبق کر دی جائے (ص ۱۵۸)۔ مسلمانوں کے لیے حکومت خواہ انتخاب کے ذریعے برسراقتدار آنے والے صدر کی صورت میں ہو یا کوئی اور دوسرا نظام کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ ان کی تمام تر دلچسپی تو حکومت الٰہیہ میں ہے" (ص ۱۵۹)۔ کتاب کا غالب ترین حصہ ایسی ہی ایمان افروز سوچ سے گندھا ہوا ہے لیکن بعض مقامات پر ان کے طرز استدلال سے اتفاق ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر چہرے کے پردے کو وہ ایک "احمقانہ مصیبت" (ص ۱۳۵) قرار دیتے ہیں۔ البتہ اپنی راست روی کی وجہ سے وہ آگے چل کر یہ بھی کہتے ہیں: "جب مسلمان عورتیں اپنی آزادی پر بحث کریں تو انھیں اسلامی نصب العین پیش نظر رکھنا چاہیے۔ وگرنہ چشمہ حیات کے عوض سراب کی لامتناہی جستجو میں مبتلا ہو جائیں گی" (ص ۱۴۲)۔

پکتھال نے جو احادیث پیش کی ہیں ان میں بعض کی سند بہت کمزور ہے۔ مثال کے طور پر: "عالم کی روشنی شہید کے خون سے زیادہ مقدس ہے" (ص ۱۷) یا "رب کی پیدا کردہ کائنات پر ایک گھنٹے غور و فکر کرنا ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے" (ص ۱۷) یا پھر: "علم حاصل کرو، خواہ تمھیں چین جانا پڑے" (ص ۱۸، ۴۳، ۶۵)۔ اس لیے مترجم کی ذمہ داری تھی کہ وہ آیات کے درست حوالے دیتے، متن پیش کرنے کا اہتمام کرتے اور احادیث نبویؐ کے حوالے اور متن پیش کر کے تخریج کرتے۔ اس سے موضوع، ضعیف اور متروکات کی نشان دہی ہو جاتی۔ مصنف سے اگر کوئی کوتاہی رہ جائے تو مترجم یا مرتب کو اپنے نوٹس یا حواشی میں اس کمی کو ضرور دور کرنا چاہیے۔ اسی طرح کتاب کے تمام ہی ابواب میں کچھ حوالہ جات کے نمبر دیے گئے ہیں مگر ان حوالہ جات کا متن کہیں دستیاب نہیں ہوتا۔ سید سلیمان ندوی نے مدراس میں سیرت رسولؐ پر خطبات دیے تھے۔ مترجم نے انھیں "نقوش سلیمانی" قرار دیا ہے (ص ۷)۔ حالانکہ یہ کتاب ان کے مختلف مضامین و خطبات کا مجموعہ ہے، البتہ سیرت پر جو خطبات دیے، انھیں خطبات مدراس ہی کہا جاتا ہے۔

بہرحال اردو خواں طبقے کے لیے ایک اچھی قابل قدر دستاویز ہے (س - م - خ)۔

مدیر کے نام

لیاقت علی کھوکھر' منچن آباد

اخوان المسلمون پر طویل مقالہ (مارچ اپریل مئی ۹۹) معلوماتی اور ہمہ گیر جائزہ پر مشتمل ہے جس سے اس صدی کی عظیم جدوجہد سے آگاہی حاصل ہوئی ہے۔ اسلامی تحریکوں کی نصف صدی سے زائد جدوجہد کے بعد اب ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہم اپنی اس جدوجہد کا ناقدانہ جائزہ لیں۔ معاشرے پر اس کے اثرات' کارکنوں کی فکری اور عملی صورت حال' بالخصوص جمہوری سیاست میں بھرپور شرکت کا تجربہ' اس کے اثرات' کامیابیاں اور ناکامیاں۔ علمی میدان میں ہماری کاوشیں' مغربی تہذیب و ثقافت کا چیلنج' ذرائع ابلاغ کے ذریعے اس کی یلغار' اور معاشروں پر اس کے بڑھتے ہوئے اثرات' ہمارے دفاعی حصار' تعلق باللہ' فکر آخرت اور خاندانی نظام کا استحکام وغیرہ---- کیا ترجمان القرآن بحث و نظر کے عنوان سے اس موضوع پر اہل علم و فکر کی تحریروں کو پیش کر کے کوئی مناسب رہنمائی نہیں کر سکتا؟

امجد عباسی' لاہور

کوسووا کا المیہ (مئی ۹۹) میں اس پہلو کو اجاگر کرنے کی ضرورت تھی کہ امریکہ اور یورپ کو مسلمانوں سے ہمدردی نہیں ہے بلکہ وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہ رہے ہیں۔ سربیا کو اس لیے سزا دینا چاہتے ہیں کہ کہیں وہ روسی حمایت سے طاقت بن کر یورپ میں ان کے لیے مسئلہ نہ پیدا کرے اور دوسری طرف فضائی حملے کر کے لیکن زمینی فوج نہ بھیج کر یہ اطمینان حاصل کر لیا ہے کہ سرب فوج کو نسلی صفائی کا جواز فراہم ہو جائے اور کوسووا کے مسلمانوں کی مدد بھی نہ ہو۔ کے ایل اے پر اسلحہ کی پابندی بھی اسی حکمت عملی کا حصہ ہے۔ یہ بات بھی آنا چاہیے تھی کہ امت مسلمہ مجموعی طور پر جس ذلت اور بے بسی کا شکار ہے' یہ اللہ تعالیٰ سے عہد شکنی اور مقصد سے غفلت کا نتیجہ ہے۔

سید احمد علی' کراچی

دعوت اسلامی کی نئی جہتیں (مئی ۹۹) میں محترم خرم مرادؒ نے جن نئی راہوں کی نشان دہی کی ہے' وہ غور و فکر اور عمل کا تقاضا کرتی ہیں۔ انھوں نے وفود کی آمد کے حوالے سے سیرت کے جو واقعات پیش کیے ہیں ان سے بالکل نئی رہنمائی ملتی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ ہماری روایتی دینی سوچ ہی نہیں' تحریکی سوچ بھی ٹھہر گئی ہے اور رویے بھی لگے بندھے ہو گئے ہیں۔ جیسا کہ انھوں نے کہا کہ ہم مغالطوں کا شکار ہیں۔ آج سے ۵۰' ۶۰ سال پہلے جس انقلابی فکر سے تحریک اسلامی کا آغاز ہوا تھا اس کا منبع و ماخذ قرآن و سنت اور سیرت پاک تھا۔ نئی صدی کے لیے انقلابی فکر بھی انھی ماخذ سے حاصل ہو گی۔ ضرورت اجتہادی طرز فکر کی ہے۔

ناہید تبسم' فیصل آباد

اقبال کا تصور جہاد (اپریل ۹۹) میں لکھا گیا ہے کہ سرسید نے جہاد کے تصور کو مسخ و منسوخ کرنے کی کوشش کی۔ میرا دل اسے تسلیم نہیں کرتا۔ انھیں رسولؐ اللہ سے اتنی عقیدت و محبت تھی' کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ جہاد کو ناپسند کرتے ہوں۔ کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ رسالت مآبؐ نے ساری زندگی جہاد کیا۔

عثمان ظفر' راولپنڈی

کچھ موضوعات کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ اسلام اور مغرب' جس میں مسلمانوں کے بارے میں مغرب کے خدشات اور رویہ' مسلمانوں کا نقطۂ نظر اور مغربی رسائل و جرائد سے منتخب تحریرات کے تراجم پیش کیے جاتے تھے' اب نظر نہیں آتا۔ بحث و نظر کا سلسلہ بھی جاری رہنا چاہیے۔ تذکرہ مودودی" کے خوب صورت مطالعہ پر رفیع الدین ہاشمی صاحب کو مبارک باد۔ سرورق کے رنگ اور ڈیزائن بہت پیارے ہیں' سادہ اور پُروقار۔

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک 'اچھرہ' لاہور سے شائع کیا

مدیر کے نام

لیاقت علی کھوکھر' مینن آباد

اخوان المسلمون پر طویل مقالہ (مارچ اپریل مئی ۹۹) معلوماتی اور ہمہ گیر جائزہ پر مشتمل ہے جس سے اس صدی کی عظیم جدجہد سے آگاہی حاصل ہوئی ہے۔ اسلامی تحریکوں کی نصف صدی سے زائد جدوجہد کے بعد اب ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہم اپنی اس جدوجہد کا ناقدانہ جائزہ لیں۔ معاشرے پر اس کے اثرات' کارکنوں کی فکری اور عملی صورت حال' بالخصوص جمہوری سیاست میں بھرپور شرکت کا تجربہ' اس کے اثرات' کامیابیاں اور ناکامیاں۔ علمی میدان میں ہماری کاوشیں' مغربی تہذیب و ثقافت کا چیلنج' ذرائع ابلاغ کے ذریعے اس کی یلغار' اور معاشروں پر اس کے بڑھتے ہوئے اثرات' ہمارے دفاعی حصار' تعلق باللہ' فکر آخرت اور خاندانی نظام کا استحکام وغیرہ---- کیا ترجمان القرآن بحث و نظر کے عنوان سے اس موضوع پر اہل علم و فکر کی تحریروں کو پیش کر کے کوئی مناسب رہنمائی نہیں کر سکتا؟

امجد عباسی' لاہور

کوسووا کا المیہ (مئی ۹۹) میں اس پہلو کو اجاگر کرنے کی ضرورت تھی کہ امریکہ اور یورپ کو مسلمانوں سے ہمدردی نہیں ہے بلکہ وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہ رہے ہیں۔ سربیا کو اس لیے سزا دینا چاہتے ہیں کہ کہیں وہ روسی حمایت سے طاقت بن کر یورپ میں ان کے لیے مسئلہ نہ پیدا کرے اور دوسری طرف فضائی حملے کر کے لیکن زمینی فوج نہ بھیج کر یہ اطمینان حاصل کر لیا ہے کہ سرب فوج کو نسلی صفائی کا جواز فراہم ہو جائے اور کوسووا کے مسلمانوں کی مدد بھی نہ ہو۔ کے ایل اے پر اسلحہ کی پابندی بھی اسی حکمت عملی کا حصہ ہے۔ یہ بات بھی آنا چاہیے تھی کہ امت مسلمہ مجموعی طور پر جس ذلت اور بے بسی کا شکار ہے' یہ اللہ تعالیٰ سے عہد شکنی اور مقصد سے غفلت کا نتیجہ ہے۔

سید احمد علی' کراچی

دعوت اسلامی کی نئی جہتیں (مئی ۹۹) میں محترم خرم مراد" نے جن نئی راہوں کی نشان دہی کی ہے' وہ غور و فکر اور عمل کا تقاضا کرتی ہیں۔ انھوں نے وفود کی آمد کے حوالے سے سیرت کے جو واقعات پیش کیے ہیں ان سے بالکل نئی رہنمائی ملتی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ ہماری روایتی دینی سوچ ہی نہیں' تحریکی سوچ بھی ٹھہر گئی ہے اور رویے بھی لگے بندھے ہو گئے ہیں۔ جیسا کہ انھوں نے کہا کہ ہم مغالطوں کا شکار ہیں۔ آج سے ۵۰' ۶۰ سال پہلے جس انقلابی فکر سے تحریک اسلامی کا آغاز ہوا تھا اس کا منبع و ماخذ قرآن و سنت اور سیرت پاک تھا۔ نئی صدی کے لیے انقلابی فکر بھی انھی ماخذ سے حاصل ہو گی۔ ضرورت اجتہادی طرز فکر کی ہے۔

ناہید تبسم' فیصل آباد

اقبال کا تصور جہاد (اپریل ۹۹) میں لکھا گیا ہے کہ سرسید نے جہاد کے تصور کو مسخ و منسوخ کرنے کی کوشش کی۔ میرا دل اسے تسلیم نہیں کرتا۔ انھیں رسول" اللہ سے اتنی عقیدت و محبت تھی' کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ جہاد کو ناپسند کرتے ہوں۔ کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ رسالت مآب" نے ساری زندگی جہاد کیا۔

عثمان ظفر' راولپنڈی

کچھ موضوعات کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ اسلام اور مغرب' جس میں مسلمانوں کے بارے میں مغرب کے خدشات اور رویہ' مسلمانوں کا نقطۂ نظر اور مغربی رسائل و جرائد سے منتخب تحریرات کے تراجم پیش کیے جاتے تھے' اب نظر نہیں آتا۔ بحث و نظر کا سلسلہ بھی جاری رہنا چاہیے۔ تذکرہ مودودی" کے خوب صورت مطالعہ پر رفیع الدین ہاشمی صاحب کو مبارک باد۔ سرورق کے رنگ اور ڈیزائن بہت پیارے ہیں' سادہ اور پروقار۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللہ نے اس آدمی کے لیے عذر کا کوئی موقع باقی نہیں رکھا جس کو ساٹھ برس تک دنیا میں مہلت دی (بخاری)۔

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵- اے ذیلدار پارک 'اچھرہ' لاہور سے شائع کیا

زخمی، معذور اور بیمار مجاہدین، مہاجرین کا ادارہ

کشمیر سرجیکل ہسپتال

زیر اہتمام: پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن

- اکتوبر 1990 سے جون 1999ء تک 360000 ہزار مریضوں کا مفت اور مکمل علاج کیا گیا۔
- 1000 سے زائد افراد کو فراست بائٹ سے نجات دلا کر معذور ہونے سے بچالیا گیا۔ (الحمد للہ)
- تمام مہاجرین اور عسکری تنظیموں کے مجاہدین کا مکمل اور مفت علاج کیا جارہا ہے
- کشمیر سرجیکل ہسپتال کے تحت متحدہ جہاد کونسل میں شامل تمام تنظیموں کے کیمپوں 60 فرسٹ ایڈ سنٹر کام کر رہے ہیں
- روزانہ 250 سے 350 مریضوں کو مفت طبی امداد فراہم کی جاتی ہے
- ہسپتال کے زیر اہتمام مہاجرین کے کیمپوں میں چار مستقل ڈسپنسریاں اور چار ایمبولینس گاڑیاں ہمہ وقت مصروف کار ہیں جبکہ کیمپوں میں چار نئی ڈسپنسریاں قائم کی جارہی ہیں۔
- مظفر آباد اور کوٹلی میں چار ایمبولنس گاڑیاں ہمہ وقت مصروف کار ہیں
- دو نئے وارڈ کی تعمیر جاری ہے
- معذور مجاہدین اور مہاجرین کو 800 سے زائد مصنوعی اعضاء لگائے گئے

ہسپتال کے لئے تعاون صرف کراس چیک / ڈرافٹ کی صورت میں ارسال کریں۔ ٹریولر چیک کی صورت میں رقم ارسال نہ کریں۔

کیا آپ کا بھی اس میں کوئی حصہ ہے













خوش نصیب ہے جو گھر بیٹھے

★ غزوہ ہند میں شریک ہے ★ اپنی ملت کی زخمی شہ رگ سے بہتے لہو پر مرہم رکھ رہا ہے ★ زخمی و معذور مجاہدین و مہاجرین کی خدمت اور عیادت کا ثواب حاصل کر رہا ہے ★ عظیم ملی فریضے کی ادائیگی کر رہا ہے

اور رسول ﷺ سے جنت کی بشارت پا رہا ہے (الحدیث) اور جو اس سے محروم ہے وہ یقیناً بہت ہی محروم ہے

آپ نقد عطیات کے علاوہ ادویات کی صورت میں بھی مدد کر سکتے ہیں

تعاون کے لیے

ڈاکٹر محمود حسین کیانی (میڈیکل سپرینٹنڈنٹ)

کشمیر سرجیکل ہسپتال پولٹری فارم روڈ مظفر آباد آزاد جموں کشمیر

فون۔ 058810-3700

اکاؤنٹ نمبر 1128
بنک آف پنجاب
مظفر آباد آزاد کشمیر

C.P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

Monthly **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE,